فہرست

شذرات	نئے میدان جنگ کا انتخاب	منظور الحسن	۲
قرآنیات	البقرہ (۲: ۲۴۳-۲۴۵)	جاوید احمد غامدی	۵
معارفِ نبوی	اسلام کے پانچ ستون	زاویۂ فراہی	۹
	موت کی جگہ - بچوں کا انجام	طالب محسن	۱۴
دین و دانش	قانون جہاد	جاوید احمد غامدی	۱۹
حالات و وقائع	عروج و زوال کا قانون (۴)	ریحان احمد یوسفی	۵۱
	ایک عراقی کا سوال	محمد بلال	۵۹
اصلاح و دعوت	متفرق مضامین	ریحان احمد یوسفی	۶۱
ادبیات	شہر آشوب	جاوید احمد غامدی	۶۶

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

نئے میدان جنگ کا انتخاب

ہزیمت کی تاریخ ایک مرتبہ پھر دہرائی گئی ہے۔ میسور، پلاسی، بالاکوٹ، دہلی اور افغانستان کے جنگی میدانوں کی طرح ہم عراق کے میدان جنگ میں بھی مغلوب و رسوا ہوئے ہیں۔ اس شکست کے اسباب و عواقب کے بارے میں ہمارے ارباب علم و دانش مختلف الخیال ہیں۔ بعض اسے اللہ کی آزمایش سے تعبیر کر کے عزیمت و استقامت کا درس دے رہے ہیں۔ بعض قومی انتشار کا نتیجہ تصور کر کے اتحاد و یک جہتی کی تلقین کر رہے ہیں اور بعض سپر پاور کی عسکری برتری کا مظہر قرار دے کر عسکری قوت کے حصول کا لائحۂ عمل تجویز کر رہے ہیں۔ یہ سب تجزیے اور تجاویز درست ہو سکتی ہیں، مگر ایک حقیقت ان کے ماسوا بھی موجود ہے جس سے ہماری فکری اور سیاسی قیادت مسلسل صرف نظر کر رہی ہے۔ وہ حقیقت یہ ہے کہ ہماری قوم نے جنگ کے لیے غلط میدان کا انتخاب کر رکھا ہے۔ ایک ایسا میدان جنگ جس میں ہم گزشتہ تین صدیوں سے پے در پے شکست کھا رہے ہیں۔ یہ مادی قوت کا میدان ہے۔ اس قوت کا مظہر اگر دولت ہے تو ہمارے ہاتھ میں کاسۂ گدائی ہے، اگر علم و فن ہے تو ہمارا جہل مسلم ہے، اگر اسلحہ ہے تو ہم بے دست و پا ہیں اور اگر اقتدار ہے تو ہم محکوم محض ہیں۔ مادی قوت کے ان تمام مظاہر سے ہمارا وجود بالکل خالی ہے۔ اس حقیقت کے تلخ نتائج کا مسلسل شکار ہونے کے باوجود ہم مسلسل اسی میدان میں جان کی بازی لگا رہے ہیں۔ یہ عمل اگر سوچا سمجھا ہوتا تو سوچ کے زاویوں کو نیا رخ دے کر ہزیمت کی گردش سے نکلا جا سکتا تھا، مگر المیہ یہ ہے کہ یہ سرتاسر بے شعوری پر مبنی ہے۔ ہمیں یہ معلوم ہی نہیں ہے کہ ہم مادی قوت کے جس میدان میں برسر جنگ ہیں، اس میں فتح و کامرانی کے اسباب علوم و فنون، زراعت و معدنیات اور صنعت و تجارت ہیں۔ انھیں بعض اقوام نے جمع کر کے مادی قوت کے میدان میں اپنی اجارہ داری قائم کر رکھی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ جذباتی نعروں، موہوم تمناؤں اور بے بنیاد دعووں کے ذریعے سے ہم یہ اجارہ داری ختم کر سکتے ہیں۔ ہماری بے شعوری کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ ہم نے افغانستان میں اپنی کمزوری کا ہر سطح پر مشاہدہ کر لینے کے بعد بھی سرزمین عراق کو اسی میدان جنگ کا مرکز بننے دیا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

بہر حال صداقت صرف اور صرف یہ ہے کہ موجودہ حالات میں مادی قوت کا میدان ہماری ہزیمت کا میدان ہے۔ ہم اگر اسی کمزور حیثیت سے اس میدان میں برسر پیکار رہے تو بربادی کی عبرت انگیز داستانیں رقم ہوتی رہیں گی اور قانون الٰہی کے عین مطابق شکست ہی ہمارا مقدر ٹھہرے گی۔ اس میدان میں اگر ہم کوئی کامیابی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ پہلے اس میدان سے نکل کر مادی قوت کے وہ تمام اسباب و وسائل حاصل کریں جو کامیابی کے لیے ناگزیر ہیں۔ ان کے حصول کے لیے ایک طویل جدوجہد درکار ہے۔ آج اگر ہم اس جدوجہد کا آغاز کریں تو ممکن ہے کہ ایک مدت بعد انھیں حاصل کر لیں۔

تاہم، ایک میدان جنگ ایسا ہے جس میں فتح یابی کے اسباب و وسائل اس وقت بھی ہمارے پاس موجود ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم اس میں سرگرم عمل ہوں تو دنیا کی سب اقوام مل کر بھی ہمارا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ اس میدان میں ہماری فتح یقینی ہے۔ یہ مادی قوت کا نہیں، بلکہ فکری قوت کا میدان ہے۔ ہمارے پاس پروردگار عالم کی آخری ہدایت کی صورت میں لافانی فکری قوت موجود ہے۔ یہودیت ہو یا عیسائیت، بدھ مت ہو یا ہندومت، تمام مذاہب عالم پر اس کی فضیلت مسلم ہے۔ تصوف، لادینیت، اشتراکیت، سرمایہ داری اور دیگر سیاسی، معاشی اور عمرانی افکار میں سے کوئی فکر بھی اسے چیلنج کرنے کا اہل نہیں ہے۔ چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ اگر اس میدان میں مغرب سقراط و فلاطوں سے لے کر فرائڈ اور مارکس تک فلاسفہ کی تمام فکری قوت کو بھی مجتمع کر لے تب بھی اس کی رسائی محمد عربی کے افکار تک نہیں ہو سکتی۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

یہ مقدمہ اگر درست ہے تو پھر ہمیں یہ فیصلہ کر لینا چاہیے کہ اب ہمیں اقوام عالم کی علاقائی سرحدوں کو نہیں، بلکہ نظریاتی سرحدوں کو ہدف بنانا ہے، ہمیں ان کے ملکوں پر نہیں، بلکہ ان کے افکار پر تاخت کرنی ہے اور ہمیں ان کے جسموں کو نہیں، بلکہ دل و دماغ کو تسخیر کرنا ہے۔ چنانچہ اس نئے میدان میں ہمیں تعلیم و تعلم، اصلاح و دعوت اور اخلاق و کردار کے زور پر دنیا کو یہ بتانا ہے کہ پیغمبر اسلام کی رسالت ایک ثابت شدہ تاریخی حقیقت ہے۔ یہودیت اور نصرانیت جیسے الہامی ادیان کا اثبات بھی اس رسالت کے اثبات پر منحصر ہے۔ یہ واضح کرنا ہے کہ زمین پر اللہ کی ہدایت کا آخری اور حتمی منبع قرآن مجید ہے۔ اس کی حفاظت کے انتظام، اس کی شان کلام اور اس کے خالص عقلی و فطری مشمولات کی بنا پر اس کی حاکمیت دیگر الہامی صحائف اور افکار فلاسفہ پر ہر لحاظ سے قائم ہے۔ چنانچہ عقیدہ و ایمان اور فلسفہ و اخلاق کے تمام مباحث میں رہتی دنیا تک اسے میزان اور فرقان کی حیثیت حاصل ہے۔ ہر نظریے اور ہر عمل کو اب اس کی ترازو میں تلنا اور اس کی کسوٹی پر پرکھا جانا ہے۔ اس میدان میں ہمیں یہ بھی تسلیم کرانا ہے کہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو صحیح خطوط پر قائم کرنے کا واحد راستہ اسلامی شریعت ہے۔ اس ضمن میں یہ ان مسئلوں کو بھی حل کرتی ہے، جنھیں انسانی عقل اپنی محدودیتوں کی وجہ سے حل نہیں کر سکتی۔ اس کی روشنی میں ایک ایسا معاشرہ تشکیل پا سکتا ہے جس میں حیا کو بنیادی قدر کی حیثیت حاصل ہو اور معاشرے کی اکائی خاندان کو اس قدر استحکام حاصل ہو کہ انسان بچپن اور بڑھاپے کی ناتواں زندگی بھی خوش و خرم گزار سکے۔ ایک ایسا نظم معیشت وجود میں آ سکتا

ہے جو لالچ، جھوٹ اور استحصال سے پاک ہو۔ ایک ایسی ریاست وجود میں آسکتی ہے جس کا نظام شہریوں کی فلاح کا ضامن اور عدل وانصاف کا عکاس ہو۔ اس کی برکت سے دنیا میں ایک ایسے ماحول کا وجود پزیر ہونا ممکن ہے جس میں انسان کا اصل ہدف دنیا نہیں، بلکہ آخرت ہو۔ انسان اپنی دنیوی ذمہ داریاں مسابقت کے پورے جذبے کے ساتھ انجام دے، مگر اس کے ساتھ ساتھ اس کی نظر اخروی کامیابی پر ہو۔ اس بنا پر یہ بات یقینی طور پر کہی جا سکتی ہے کہ شریعت کی روشنی جس خطۂ ارضی کو منور کر دے، اس میں دہشت، درندگی، ظلم اور اخلاق باختگی کے مظاہر شاذ ہو جاتے ہیں۔

فکری قوت کے اس میدان میں پیش قدمی کو حالات زمانہ نے بہت ساز گار بنا دیا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک افراد، اقوام اور حکمران جنگ کی نفسیات میں جیتے تھے۔ جس کے پاس مادی قوت ہو، اس کا یہ حق تسلیم شدہ تھا کہ وہ اگر چاہے تو اخلاقی جواز کے بغیر بھی کمزور کو تر نوالا بنا لے۔ چنگیز، ہلاکو، ہٹلر اور میسولینی جیسے حکمران قوموں کی تباہی کو اپنا حق سمجھتے تھے۔ خوف و دہشت کو بین الاقوامی قانون کی حیثیت حاصل تھی۔ یہ فضا اب تبدیل ہوگئی ہے۔ دنیا کا اجتماعی ضمیر جنگ کی نفسیات سے نکل آیا ہے۔ جنگ سے نفرت اور امن سے محبت کا چلن ہے۔ انسان دوسرے انسانوں کے اور اقوام دوسری قوموں کے حق خود ارادی کو تسلیم کرنے لگی ہیں۔ خوف و دہشت کے مظاہر عظمت کے بجائے ذلت کی علامت قرار پا گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امریکی قیادت کو اپنی ظالمانہ کارروائی کے لیے بھی دہشت گردی، کیمیائی ہتھیار اور آمریت جیسے مقدمات کا سہارا لینا پڑا ہے اور اس کے باوجود امریکہ سمیت پوری دنیا، بلا استثنائے قوم و مذہب سراپا احتجاج ہے۔ پھر میڈیا کی عظیم وسعت نے دنیا کے ہر شخص تک رسائی کا دروازہ کھول دیا ہے۔ اس صورت حال میں اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اسلام کی دعوت کے لیے میدان بالکل صاف ہے اور یہ آج جس قدر موثر ہو سکتی ہے، گزشتہ زمانے میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ اس وقت ہمارے لیے واحد لائحۂ عمل یہ ہے کہ جب تک ہم مادی اعتبار سے ضروری قوت بہم نہیں پہنچا لیتے، اس وقت تک اپنی تمام تر توانائیاں فکری قوت کے میدان میں بروئے کار لائیں۔ یہی ہماری فتح یابی کا میدان ہے۔ ایک ایسا میدان جس میں شکست کا کوئی تصور نہیں ہے۔

ـــــ منظور الحسن

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورة البقرة

(۵۲)

(گزشتہ سے پیوستہ)

اَلَمْ تَرَاِلَی الَّذِیْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ، وَھُمْ اُلُوْفٌ، حَذَرَ الْمَوْتِ. فَقَالَ لَھُمُ اللّٰہُ: مُوْتُوْا، ثُمَّ اَحْیَاھُمْ، اِنَّ اللّٰہَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَی النَّاسِ

(یہ مباحث جہاد و انفاق کے بارے میں تمھارے سوالوں سے پیدا ہوئے تھے۔ ایمان والو، اِن کا حکم تم پر شاق نہ ہونا چاہیے)۔ کیا تم نے اُن لوگوں کو نہیں دیکھا[۶۳۴] جو ہزاروں کی تعداد میں تھے اور موت کے ڈر سے اپنے گھر چھوڑ کر اُن سے نکل کھڑے ہوئے[۶۳۵]۔ اِس پر اللہ نے فرمایا کہ مردے ہو کر جیو[۶۳۶]۔ (وہ برسوں اِسی حالت

[۶۳۴] اصل میں 'الم تر' کے الفاظ آئے ہیں۔ واحد سے جمع کو خطاب کرنے کا یہ اسلوب اس وقت اختیار کیا جاتا ہے، جب کسی گروہ کے ہر شخص کو فرداً فرداً مخاطب کرنا پیش نظر ہوتا ہے۔ اس میں 'الم تر' کے معنی لازماً یہ نہیں ہوتے کہ مخاطبین نے واقعہ آنکھوں سے دیکھا ہے۔ کسی واقعہ کی شہرت عام ہو یا متکلم یہ سمجھتا ہو کہ اس کی صداقت ایسی مسلم ہے کہ اس میں شبے کی کوئی گنجایش نہیں ہو سکتی تو وہ یہ اسلوب اختیار کر سکتا ہے۔

[۶۳۵] یہ اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے، جب فلستیوں نے بنی اسرائیل پر چڑھائی کر کے ان کا قتل عام کیا اور ان سے عہد کا وہ صندوق چھین لیا جس کی حیثیت ان کے ہاں بالکل قبلہ کی تھی۔ بائیبل میں ہے:

> "اور فلستی لڑے اور بنی اسرائیل نے شکست کھائی اور ہر ایک اپنے ڈیرے کو بھاگا اور وہاں نہایت بڑی خون ریزی ہوئی کیونکہ تیس ہزار اسرائیلی پیادے وہاں کھیت آئے اور خدا کا صندوق چھن گیا۔" (سموئیل ۴: ۱۰۔۱۱)

اس واقعے کی جو تفصیلات سموئیل باب ۷ اور ۱۱ میں بیان ہوئی ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل اگرچہ تین لاکھ

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

وَ لٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَشْکُرُوْنَ. ﴿۲۴۳﴾

میں رہے[۶۳۷])، پھر اللہ نے اُنھیں دوبارہ زندگی عطا فرمائی[۶۳۸]۔ اِس میں شبہ نہیں کہ اللہ لوگوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے، مگر لوگوں میں زیادہ ہیں جو (اُس کے) شکر گزار نہیں ہوتے[۶۳۹]۔ ۲۴۳

سے زیادہ تھے، مگر اپنی مذہبی واخلاقی حالت کی خرابی اور سیاسی ابتری کے باعث فلستیوں کا مقابلہ نہیں کر سکے اور عقرون سے لے کر جات تک اپنے شہر خالی کر کے ان کے حوالے کرنے پر مجبور ہو گئے۔

[۶۳۶] اصل میں لفظ 'مُوتوا' آیا ہے، یعنی مر جاؤ۔ یہ قومی حیثیت سے ذلت اور نامرادی کی تعبیر ہے۔ ذریت ابراہیم کے معاملے میں اللہ کا قانون یہی تھا کہ ان کے جرائم کی سزا انھیں دنیا ہی میں دی جائے گی۔ چنانچہ جب ایمان اور عمل صالح کے بجائے انھوں نے اخلاقی بے راہ روی اور خوف و بزدلی کی زندگی اختیار کی اور اس طرح اللہ کے ساتھ نقض عہد کے مرتکب ہوئے تو اس کی سزا کے طور پر اللہ نے بھی انھیں ذلت و نامرادی کے حوالے کر دیا۔

[۶۳۷] سموئیل میں ہے کہ بنی اسرائیل پر یہ حالت پورے بیس سال تک طاری رہی:

''اور جس دن سے صندوق قریت یعریم میں رہا، تب سے ایک مدت ہوگئی، یعنی بیس برس گزرے اور اسرائیل کا سارا گھرانا خداوند کے پیچھے نوحہ کرتا رہا۔'' (۷:۲)

[۶۳۸] یہ زندگی اسی قانون کے مطابق دی گئی جس کا ذکر اوپر ہوا ہے۔ بنی اسرائیل نے توبہ استغفار کر کے از سر نو ایمان واسلام کی راہ اختیار کی تو اللہ تعالیٰ نے بھی اس کے صلے میں انھیں قومی حیثیت سے از سر نو زندہ کر دیا اور دشمنوں کے مقابلے میں عزت اور سربلندی عطا فرمائی۔ سموئیل میں ہے:

''اور سموئیل نے اسرائیل کے سارے گھرانے سے کہا کہ اگر تم اپنے سارے دل سے خداوند کی طرف رجوع لاتے ہو تو اجنبی دیوتاؤں اور عستارات کو اپنے بیچ سے دور کرو اور خداوند کے لیے اپنے دلوں کو مستعد کر کے فقط اسی کی عبادت کرو، اور وہ فلستیوں کے ہاتھ سے تمھیں رہائی دے گا۔ تب بنی اسرائیل نے بعلیم اور عستارات کو دور کیا اور فقط خداوند کی عبادت کرنے لگے''۔ (۷:۳-۴)

''سو فلستی مغلوب ہوئے اور اسرائیل کی سرحد میں پھر نہ آئے اور سموئیل کی زندگی بھر خداوند کا ہاتھ فلستیوں کے خلاف رہا اور عقرون سے جات تک کے شہر جن کو فلستیوں نے اسرائیلیوں سے لے لیا تھا، وہ پھر اسرائیلیوں کے قبضے میں آئے اور اسرائیلیوں نے ان کی نواحی بھی فلستیوں کے ہاتھ سے چھڑالی۔'' (۷:۱۳-۱۴)

[۶۳۹] اس میں بنی اسمٰعیل کے لیے تشویق ہے کہ اگر وہ بھی جہاد و انفاق کی دعوت قبول کریں گے تو اللہ ذریت ابراہیم کے ساتھ اپنے وعدے کے مطابق ان پر فضل فرمائے گا اور انھیں عروج و سربلندی سے سرفراز کرے گا۔ اسی طرح تنبیہ بھی ہے

وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ، وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ.﴿۲۴۴﴾ مَنْ ذَاالَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا، فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ اَضْعَافًا کَثِیْرَۃً، وَاللّٰہُ

(ایمان والو، اِس سے سبق لو) اور اللہ کی راہ میں جنگ کرو اور خوب جان رکھو کہ اللہ سمیع و علیم ہے[۶۴۰]۔ کون ہے جو (اِس جنگ کے لیے) اللہ کو قرض دے گا، اچھا قرض کہ اللہ اُس کے لیے اُسے کئی گنا بڑھا دے[۶۴۱]۔ اور اللہ ہی ہے جو تنگی بھی کرتا ہے اور فراخی بھی۔ (اِس لیے جو کچھ ملا ہے، یہ اُسی کی عنایت ہے) اور تم کو (ایک دن)

کہ اگر وہ موت سے ڈر گئے اور انھوں نے اپنے لیے ذلت و نامرادی کو پسند کیا تو اسی وعدے کے مطابق ان پر بھی یہی موت طاری ہو کر رہے گی۔

[۶۴۰] ان صفات کا حوالہ دینے سے مقصود، استاذ امام کے الفاظ میں یہاں اس کا لازم ہے۔ یعنی جب اللہ سنتا اور جانتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ تمھاری پکار پر تمھاری مدد بھی فرمائے گا اور تمھاری جاں بازیوں کا بھرپور صلہ بھی دے گا۔

[۶۴۱] یہ اللہ کی راہ میں جنگ کے لیے غایت درجہ موثر اور نہایت شوق انگیز اسلوب میں مالی قربانی کی دعوت ہے۔ استاذ امام اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''قرض قرض دار کے ذمے واجب ہوتا ہے اور یہ رب کریم کا کتنا بڑا احسان ہے کہ جو مال اس نے خود بندوں کو عنایت فرمایا ہے، وہی مال وہ جب ان سے اپنی راہ میں خرچ کرنے کے لیے کہتا ہے تو اس کو اپنے ذمے قرض ٹھیراتا ہے، یعنی اس کی واپسی از خود اپنے ذمے واجب قرار دیتا ہے۔ پھر اس سے زیادہ روح و دل کو بے خود کر دینے والی بات یہ ارشاد ہوئی کہ رب کریم یہ قرض اس لیے مانگتا ہے کہ وہ بندوں کو دیے ہوئے خزف ریزوں کو خوب بڑھائے اور ان کو بڑھا کر ایک لازوال خزانے کی شکل میں ان کو واپس کرے۔ یعنی اس قرض کی ضرورت اس لیے نہیں پیش آئی ہے کہ خدا کے خزانے میں کوئی کمی واقع ہو گئی ہے، اس کا خزانہ بھرپور اور وہ بالکل بے نیاز و بے پروا ہے، البتہ اس کی کریمی نے اپنے بندوں کے لیے نفع کمانے کی یہ راہ کھولی ہے کہ اگر وہ چاہیں تو ایک خرچ کر کے دس گنے سے لے کر سات سو گنے تک اس کا اجر حاصل کر لیں۔''

(تدبر قرآن ۱/ ۵۶۷)

اس قرض کے متعلق اچھا قرض ہونے کی جو شرط لگائی ہے، اس کی وضاحت میں انھوں نے لکھا ہے:

''قرض حسن کا مفہوم قرآن کے دوسرے مواقع سے جو نکلتا ہے، وہ یہ ہے کہ یہ دل کی تنگی کے ساتھ محض چھدا اتارنے کے لیے نہ دیا جائے، بلکہ پوری فراخ دلی اور حوصلے کے ساتھ دیا جائے، ریا اور نمایش کے لیے نہ دیا جائے، بلکہ صرف خدا کی خوش نودی کے دیا جائے، کسی دنیوی طمع کے حصول کی غرض سامنے رکھ کر نہ دیا جائے، بلکہ صرف آخرت کے اجر کی خاطر دیا جائے اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ حقیر، کم وقعت اور ناجائز ذرائع سے حاصل کیے ہوئے مال میں سے نہ دیا جائے، بلکہ

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

يَقۡبِضُ وَ يَبۡصُطُ ، وَاِلَيۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ. ﴿٢٤٥﴾

اُسی کی طرف لوٹنا بھی ہے[٦٤٢]۔ ٢٤٤۔٢٤٥

محبوب، عزیز اور پاکیزہ کمائی میں سے دیا جائے۔'' (تدبر قرآن ١/٥٦٧)

[٦٤٢] مطلب یہ ہے کہ تم اگر اپنا مال خدا کی راہ میں نہیں دیتے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اسی کو نہیں دیتے جو بخشنے کے بعد، جب چاہے چھین بھی سکتا ہے اور جس کا معاملہ اسی دنیا تک نہیں رہ جانا، بلکہ کل آخرت میں جسے منہ بھی دکھانا ہے۔

[باقی]

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

اسلام کے پانچ ستون

[اس روایت کی ترتیب وتدوین اور شرح ووضاحت جناب جاوید احمد غامدی کی رہنمائی میں اُن کے رفقا معز امجد، منظور الحسن، محمد اسلم نجمی اور کوکب شہزاد نے کی ہے۔]

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

روی[1] انه قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم: بنی الاسلام علی خمس[2]: شهادة ان لا اله الا اللّٰه وان محمدا رسول اللّٰه[3] واقام الصلاة وایتاء الزکوة وصوم رمضان وحج البیت[4].[5]

فقال رجل (لابن عمر): الحج وصیام رمضان؟ قال (ابن عمر): لا، صیام رمضان والحج هکذا سمعته من رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم[6]. فقال له رجل: والجهاد فی سبیل اللّٰه؟ قال ابن عمر: الجهاد حسن[7]. هکذا حدثنا رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم[8].

''روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسلام کی بنا پانچ چیزوں پر قائم کی گئی ہے[1]: یہ شہادت دی جائے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں، نماز قائم کی جائے، زکوٰۃ ادا کی جائے، رمضان کے روزے رکھے جائیں اور بیت اللہ کا حج کیا جائے[2]۔

(عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے) کسی نے پوچھا: کیا (نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے) ''حج'' اور (اس کے بعد) ''رمضان کے روزے'' (فرمایا تھا)؟ انھوں نے جواب دیا: نہیں، (بلکہ آپ نے پہلے) ''رمضان کے روزے'' اور (پھر) ''حج'' (فرمایا تھا)۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے (یہ بات) اسی ترتیب سے سنی ہے۔ (اسی طرح) ایک اور شخص نے حضرت عبداللہ بن عمر سے سوال کیا: کیا اللہ کی راہ میں جہاد بھی (ان چیزوں میں شامل ہے[۳])؟ انھوں نے فرمایا: جہاد ایک اچھا عمل ہے، (مگر اس کی یہ حیثیت نہیں ہے)۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم نے اسی طرح سنا ہے۔''

ترجمے کے حواشی

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

۱۔ اسلام اپنے ظاہر کے لحاظ سے انھی پانچ چیزوں سے عبارت ہے۔ یہ غیر مسلموں کے مقابلے میں مسلمان کی پہچان ہیں۔ ان میں سے پہلی چیز اسلام اختیار کرنے کا اعلان عام ہے، جبکہ باقی چار وہ چیزیں ہیں جو ہمیشہ سے دین کے ساتھ خاص رہی ہیں۔

۲۔ اس مکالمے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان چیزوں کی اہمیت کے لحاظ سے انھیں ایک خاص ترتیب سے بیان فرمایا ہے۔ تاہم، بعض دوسری روایات میں حج کا ذکر روزے پر مقدم بھی ہے۔

۳۔ معلوم ہوتا ہے کہ سوال پوچھنے والا ''جہاد'' کو بھی وہی حیثیت دیتا تھا جو روایت میں نماز، روزہ اور حج و زکوٰۃ کو دی گئی ہے۔

متن کے حواشی

۱۔ اپنی اصل کے اعتبار سے یہ ترمذی کی روایت رقم ۲۶۰۹ ہے۔ معمولی اختلاف کے ساتھ یہ حسب ذیل مقامات پر نقل ہوئی ہے:

بخاری، رقم ۸، ۴۲۴۳۔ مسلم، رقم ۱۶۔۱۷۔ نسائی، رقم ۵۰۰۱۔ احمد ابن حنبل، رقم ۴۷۹۸، ۵۶۷۲، ۶۰۱۵، ۶۳۰۱، ۱۹۲۴۰، ۱۹۲۴۶۔ ابن خزیمہ، رقم ۳۰۸، ۳۰۹، ۱۸۸۰، ۱۸۸۱، ۲۵۰۵۔ ابن حبان، رقم ۱۵۸، ۱۴۴۶۔ بیہقی، رقم ۱۵۶۱، ۱۳، ۷۰۱۳، ۷۶۸۰۔ ابن ابی شیبہ، رقم ۳۰۳۱۱، ۱۹۵۶۳۔ عبدالرزاق، رقم ۵۰۱۱، ۹۲۷۹، ۹۲۸۰۔ الحمیدی، رقم ۷۰۳۔ نسائی سنن الکبریٰ، رقم ۱۱۷۳۲۔ ابو یعلیٰ، رقم ۵۷۸۸، ۷۵۰۲، ۷۵۰۷۔

۲۔ مصنف عبدالرزاق، رقم ۵۰۱۱ میں 'بنی الاسلام علی خمس' (اسلام کی بنا پانچ چیزوں پر قائم ہے) کے بجائے 'بنی الاسلام علی ثمانیة اسهم' (اسلام کی بنا آٹھ اجزا پر استوار ہے) کے الفاظ آئے ہیں۔ مزید براں اس روایت میں 'والامر بالمعروف والنهی عن المنکر' (اور معروف کا حکم دینا اور منکر سے روکنا) کے الفاظ کا اضافہ بھی ہے۔ یہ روایت ان الفاظ پر ختم ہوتی ہے: 'وقد خاب من لا سهم له' (وہ شخص ناکام ٹھہرا جو ان میں سے کوئی جز نہ پا سکا)۔

۳۔ بعض روایات مثلاً مسلم، رقم ۱۶ میں 'شهادة ان لا اله الله و ان محمدا رسول الله' (اس بات کی گواہی کہ اللہ کے سوا کوئی الہٰ نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں) کی جگہ 'ان یوحد الله' (یہ کہ اللہ کی وحدانیت کا اعلان کیا جائے) کے الفاظ آئے ہیں، جبکہ مسلم، رقم ۱۶ میں اس کی جگہ 'ان یعبد الله و یکفر بما دونه' (کہ تم اللہ کی عبادت کرو اور اس کے سوا ہر کسی کی عبادت سے انکار کرو) کے الفاظ آئے ہیں۔

۴۔ بخاری، رقم ۴۲۴۳ میں یہ روایت اس پس منظر کے ساتھ بیان ہوئی ہے:

روی عنه جاء الی عبد اللّٰه بن عمر رجلان فی فتنة بن الزبیر. فقالا : ان الناس ضیعوا وانت بن عمر وصاحب النبی صلی اللّٰه علیه وسلم فما یمنعك ان تخرج. فقال: یمنعنی ان اللّٰه حرم دم اخی. فقالا: الم یقل اللّٰه: "وقاتلوهم حتی لاتکون فتنة." فقال: قاتلنا حتی لم تکن فتنة وکان الدین للّٰه وانتم تریدون ان تقاتلوا حتی تکون فتنة ویکون الدین لغیر اللّٰه. وزاد عثمان بن صالح عن بن وهب قال: اخبرنی فلان وحیوة بن شریح عن بکر بن عمرو المعافری ان بکیر بن عبد اللّٰه حدثه عن نافع ان رجلا اتی بن عمر. فقال: یا ابا عبد الرحمن ما حملك علی ان تحج عاما و تعتمر عاما وتترك الجهاد فی سبیل اللّٰه عزوجل؟ قد

"روایت ہے کہ فتنۂ ابن زبیر کے زمانے میں ایک مرتبہ دو آدمی عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے۔ انھوں نے کہا: لوگ ضائع ہو رہے ہیں اور آپ عمر رضی اللہ عنہ کے صاحب زادے اور صحابی رسول ہونے کے باوجود اس صورت حال سے غیر متعلق ہیں۔ آپ کو کیا چیز اس معاملے میں مداخلت سے روک رہی ہے؟ انھوں نے جواب دیا: مجھے یہ بات روک رہی ہے کہ اللہ نے مجھ پر اپنے بھائی کا خون حرام ٹھہرایا ہے۔ آنے والوں نے پوچھا: کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ: "انھیں قتل کرو، یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے؟" ابن عمر نے جواب دیا: ہم لڑتے رہے، یہاں تک کہ فتنہ ختم ہوا اور دین (اس شہر میں بس) اللہ کے لیے خاص ہو گیا۔ اس کے برخلاف تم اس لیے لڑنا چاہتے ہو کہ فتنہ برپا ہو اور دین پھر دوسروں کے لیے ہو جائے۔ عثمان بن صالح نے اس روایت میں ابن وہب سے یہ اضافہ نقل کیا ہے کہ مجھے حیوہ بن شریح اور ان کے علاوہ ایک اور شخص بکیر بن عمرو المعافری کے حوالے

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

علمت ما رغب الله فيه. قال: يا بن اخى بنى الاسلام على خمس: ايمان بالله و رسوله والصلاة الخمس وصيام رمضان واداء الزكاة حج البيت. قال: يا ابا عبد الرحمن الا تسمع ما ذكر الله فى كتابه: "وان طائفتان من المؤمنين اقتتلوا فاصلحوا بينهما فان بغت احداهما على الاخرى فقاتلوا التى تبغى حتى تفئ الى امر الله." "قاتلوهم حتى لا تكون فتنة." قال: فعلنا على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم. وكان الاسلام قليلا. فكان الرجل يفتن فى دينه. اما قتلوه واما يعذبونه حتى كثر الاسلام فلم تكن فتنة. قال: فما قولك فى على و عثمان؟ قال: اما عثمان فكان الله عفا عنه واما انتم فكرهتم ان تعفوا عنه. واما على فابن عم رسول الله صلى الله عليه وسلم و ختنه. واشار بيده فقال: هذا بيته حيث ترون.

سے بتایا اور انھوں نے بکیر بن عبداللہ سے اور انھوں نے نافع سے سنا کہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کے پاس ایک آدمی آیا اور اس نے پوچھا: اے ابوعبدالرحمٰن، کیا وجہ ہے کہ آپ نے ایک سال حج اور اگلے سال عمرہ تو ادا کیا، مگر اللہ کی راہ میں جہاد کو چھوڑ دیا، حالانکہ آپ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی ترغیب دی ہے؟ انھوں نے جواب دیا: عزیز بھتیجے، اسلام کی عمارت پانچ چیزوں پر استوار ہے: اللہ اور اس کے رسول پر ایمان، پانچ نمازیں، ماہ رمضان کے روزے، زکوٰۃ اور بیت اللہ کا حج۔ اس نے کہا: اے ابوعبدالرحمٰن کیا آپ اس بات سے واقف نہیں ہیں جو اللہ نے اپنی کتاب میں فرمائی ہے کہ: ''اور مسلمانوں کے دو گروہ اگر کبھی آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان صلح کراؤ۔ پھر اگر ان میں سے ایک دوسرے پر زیادتی کرے تو زیادتی کرنے والے سے جنگ کرو، یہاں تک کہ وہ اللہ کے فیصلے کی طرف لوٹ آئے۔'' اور ''انھیں قتل کرو، یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے۔'' ابن عمر نے جواب دیا: نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں ہم نے یہی کیا تھا۔ اس زمانے میں مسلمان کم تھے۔ چنانچہ لوگ دین کے معاملے میں ستائے گئے۔ انھیں قتل بھی کیا گیا اور اذیت بھی دی گئی۔ بالآخر اسلام پھیل گیا اور فتنہ باقی نہ رہا۔ اس آدمی نے پوچھا: آپ کی حضرت عثمان اور حضرت علی کے بارے میں کیا رائے ہے؟ ابن عمر نے فرمایا: سیدنا عثمان کو اللہ تعالیٰ نے معاف کر دیا، لیکن تم انھیں معاف کرنے کے لیے تیار نہیں ہو۔ رہے سیدنا علی رضی اللہ عنہ تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد اور داماد تھے۔ یہ ان کا گھر ہے، جہاں تم انھیں دیکھا کرتے تھے۔''

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

۵۔مصنف عبدالرزاق، رقم ۹۲۸۰ میں یہ الفاظ اضافی طور پر موجود ہیں: 'و الامر بالمعروف والنهی عن المنکر.'

۶۔'فقال رجل (لابن عمر) الحج .... هکذا سمعته من رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم' کسی نے پوچھا: کیا (نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے) ''حج'' .... میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے (یہ بات) اسی ترتیب سے سنی ہے) کے الفاظ پر مشتمل حصہ مسلم رقم ۱۶ سے لیا گیا ہے۔ تاہم، یہاں یہ بات واضح رہے کہ چند دوسری روایات میں پانچ ستونوں کی ترتیب بیان حج کو روزوں پر مقدم کر کے کسی قدر مختلف نقل ہوئی ہے۔

۷۔عبدالرزاق، رقم ۹۲۷۹ میں 'والجهاد حسن' (اور جہاد اچھا عمل ہے) کے الفاظ کے بجائے 'وان الجهاد والصدقه من العمل الحسن' (بے شک جہاد اور صدقہ اچھے اعمال میں سے ہیں۔) کے الفاظ آئے ہیں۔

۸۔'فقال له رجل والجهاد .... هکذاحدثنا رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم' (ایک اور شخص نے حضرت عبداللہ بن عمر سے سوال کیا: کیا اللہ کی راہ میں جہاد بھی.... نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم نے اسی طرح سنا ہے) کے الفاظ احمد ابن حنبل، رقم ۴۷۹۸ سے لیے گئے ہیں۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

طالب محسن

موت کی جگہ

(مشکوٰۃ المصابیح، حدیث: ۱۱۰۔۱۱۱)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

عن مطر بن عسكام قال: قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه و سلم إذا قضى لعبد أن يموت بأرض جعل له أليه حاجة .

''حضرت مطر بن عسکام بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کے لیے طے کر دیتے ہیں کہ وہ کسی علاقے میں وفات پائے تو اس کے لیے وہاں ایک ضرورت پیدا کر دیتے ہیں۔''

لغوی مباحث

قضى: یہ فعل فیصلہ کرنے، طے کرنے اور پورا کرنے کے معنی میں آتا ہے۔ یہاں یہ پہلے معنی میں آیا ہے۔

بأرض: 'أرض' کا لفظ پورے کرۂ ارض، کسی خطۂ ارض اور رقبے کے معنی میں آتا ہے۔ یہاں اس سے دوسرے معنی مراد ہیں۔

حاجة: اس کے لغوی معنی تو ضرورت کے ہیں، لیکن یہاں یہ اس سے وسیع مفہوم یعنی سبب کے معنی میں آیا ہے۔

متون

یہ روایت متداول کتب حدیث میں سے صرف ترمذی اور مسند احمد میں روایت ہوئی ہے۔ صاحب مشکٰوۃ نے یہ روایت ترمذی سے لی ہے۔ مسند احمد کے متون کے الفاظ قدرے مختلف ہیں، لیکن معنی و مفہوم میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا، مثلاً ایک متن میں 'إذا قضی لعبد أن یموت بأرض' کے بجائے 'إذا قضی اللّٰہ میتة عبد بأرض' اور دوسرے متن میں 'لا یقدر لأحد یموت بأرض إلا حببت إلیه' کے الفاظ آئے ہیں۔ اسی طرح ایک متن میں 'عبد' کی جگہ 'رجل' کا لفظ نقل ہوا ہے۔

معنی

یہ روایت موت کے بارے میں تقدیر کے عمل دخل کو بیان کرتی ہے۔ ہم یہ بات اس باب کی روایات کی وضاحت میں بیان کر چکے ہیں کہ موت ان امور میں سے ہے جسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے طے کر دیا گیا ہے۔ اس روایت میں یہ بات واضح کی گئی ہے کہ موت کی جگہ بھی تقدیر میں طے ہوتی ہے۔ اگر آدمی موت سے پہلے مقام مطلوب سے دور بھی ہو تو اسے مختلف اسباب پیدا کر کے وہاں پہنچا دیا جاتا ہے۔

قرآن مجید کی سورہ لقمان میں 'وما تدری نفس بأی أرض تموت' کے الفاظ میں موت کے مقام کو اس غیب میں شمار کیا گیا ہے جس کا انسان کو علم نہیں ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ موت اور موت کی جگہ اصلاً انسان کے دائرۂ تدبیر کے امور نہیں ہیں۔ یہی بات اس روایت میں بھی بیان ہوئی ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

کتابیات

ترمذی، رقم ۲۰۷۲۔ مسند احمد، رقم ۲۰۹۸۰، ۲۹۸۱۔ المعجم الکبیر، رقم ۸۰۷۔

بچوں کا انجام

عن عائشة رضی اللّٰہ عنہا قالت: قلت: یارسول اللّٰہ ذراری المؤمنین؟

قال: من آبائهم . فقلت: يارسول الله، بلاعمل؟ قال: الله أعلم بما كانوا عاملين. قلت: فذراری المشركين؟ قال: من آبائهم . قلت: بلاعمل؟ قال: الله أعلم بما كانوا عاملين .

''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: اہل ایمان کے بچوں (کا انجام کیا ہوگا)؟ آپ نے فرمایا: (وہ) اپنے آبا میں سے ہیں۔ میں نے پوچھا: بغیر کسی عمل کے؟ آپ نے فرمایا: اللہ اس بات سے خوب واقف ہے کہ وہ کیا عمل کرنے والے ہیں۔ فرماتی ہیں: میں نے اس کے بعد مشرکین کے بچوں کے بارے میں پوچھا۔ آپ نے فرمایا: (وہ) اپنے آبا میں سے ہیں۔ میں نے دریافت کیا: یہ بھی بغیر کسی عمل کے؟ آپ نے جواب دیا: اللہ تعالیٰ اس بات سے خوب واقف ہیں کہ وہ کیا عمل کرنے والے ہیں۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

لغوی مباحث

من آبائهم: یعنی انھیں ان کے آبا میں شمار کیا جائے گا۔ یہاں مبتدا اور خبر، دونوں محذوف ہیں اور صرف متعلق خبر بولا گیا ہے۔ گفتگو میں حذف کا یہ طریقہ عام ہے۔

بلا عمل: یہ ایک سوالیہ جملہ ہے اور اس سے پہلے 'أیدخلون الجنة' کے الفاظ محذوف ہیں۔

متون

یہ روایت صاحب مشکوٰۃ نے ابوداؤد سے لی ہے۔ اس روایت کے متون میں ایک نمایاں فرق یہ ہے کہ ابوداؤد نے اس روایت میں مشرکین اور مومنین، دونوں کے بچوں کے بارے میں سوال نقل کیا ہے، جبکہ دوسری کتب حدیث میں صرف مشرکین کے بچوں کے بارے میں سوال روایت ہوا ہے۔ اس روایت میں مومنین کے بچوں کے بارے میں سوال پہلے نقل ہوا ہے اور دوسرا سوال بعد میں۔ قیاس کہتا ہے کہ زیادہ امکان اسی کا ہے کہ ایک ہی سوال ہوا ہو۔ اور دوسرا سوال بعد میں توضیحاً شامل کر دیا گیا ہو، لیکن اس امکان کو رد کر دینا بھی ممکن نہیں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے دوسرا سوال بھی کیا ہو،

لیکن اس صورت میں بھی پہلا سوال مشرکین کے بچوں کے بارے میں ہی ہونا چاہیے۔

اس فرق کے علاوہ اس روایت کے متون میں کچھ لفظی فرق بھی ہیں۔مثلاً 'ذراری' کی جگہ 'أولاد' یا 'أطفال' کا لفظ آیا ہے۔'المشرکین' کے لیے ایک روایت میں 'الکفار' کا لفظ آیا ہے۔اسی طرح 'من آبائهم' کے بجائے ایک روایت میں 'هم من آبائهم' یا 'هم مع آبائهم' کی تعبیرات آئی ہیں۔ایک روایت میں 'اللّٰه أعلم بما کانوا عاملین' کے جملے میں 'إذ خلقهم' کا اضافہ روایت ہوا ہے۔

مسند احمد کی ایک روایت اس حوالے سے سب سے مختلف ہے۔اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب 'إن شئت أسمعتك تضاغیهم فی النار' (اگر تم چاہتی ہو تو میں تمھیں جہنم میں ان کی چیخ و پکار سنوا سکتا ہوں۔) کے الفاظ میں نقل ہوا ہے۔

معنی

یہ روایت آخرت کے حوالے سے قرآن مجید میں بیان کیے گئے اصول 'لیس للأنسان إلا ما سعی' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس معروف ارشاد 'کل مولود یولد علی الفطرة' کے بالکل خلاف ہے۔ان سے واضح طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جب تک انسان بڑا ہو کر شعور کے ساتھ شرک و کفر اختیار نہ کرے، اسے کوئی سزا نہیں ملنی چاہیے۔اگرچہ اس روایت کے الفاظ اور متون میں اس بات کی گنجایش نہیں ہے کہ اسے عاقل و بالغ نسل سے متعلق قرار دیا جائے، لیکن اس متن کو قبول کرنے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

کتابیات

مسلم، رقم ۲۶۵۹۔ بخاری، رقم ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۶۲۲۴، ۶۲۲۵۔ ابوداؤد، رقم ۴۰۸۹۔ احمد، رقم ۲۳۴۰۶، ۲۴۵۶۱۔ ابن حبان، رقم ۱۳۱۔ نسائی، رقم ۱۹۵۲۔ ابویعلیٰ، رقم ۲۴۷۹۔

قانون جہاد

یہ ''میزان'' کا ایک باب ہے۔ نئی طباعت کے لیے مصنف نے اس میں بعض
اہم ترامیم کی ہیں ۔ ان ترامیم کے ساتھ اسے ہم یہاں شائع کر رہے ہیں ۔

امن اور آزادی انسانی تمدن کی ناگزیر ضرورت ہے۔ فرد کی سرکشی سے اس کی حفاظت کے لیے تادیب اور سزائیں ہیں، لیکن اگر قومیں شوریدہ سر ہو جائیں تو ہر شخص جانتا ہے کہ اُن کے خلاف تلوار اٹھانے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ نصیحت اور تلقین جب تک کارگر ہو، تلوار اٹھانے کو کوئی شخص بھی جائز قرار نہ دے گا، مگر جب کسی قوم کی سرکشی اور شوریدہ سری اس حد کو پہنچ جائے کہ اسے نصیحت اور تلقین سے صحیح راستے پر لانا ممکن نہ رہے تو انسان کا حق ہے کہ اس کے خلاف تلوار اٹھائے اور اُس وقت تک اٹھائے رکھے، جب تک امن اور آزادی کی فضا دنیا میں بحال نہ ہو جائے۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ تلوار اٹھانے کی یہ اجازت اگر نہ دی جاتی تو قوموں کی سرکشی اس انتہا کو پہنچ جاتی کہ تمدن کی بربادی کا تو کیا ذکر، معبد تک ویران کر دیے جاتے اور اُن جگہوں پر خاک اڑتی، جہاں اب شب و روز اللہ پروردگارِ عالم کا نام لیا جاتا اور اس کی عبادت کی جاتی ہے:

وَلَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَ بِيَعٌ وَّ صَلَوٰتٌ وَّ مَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا. (الحج ۲۲:۴۰)

''اور اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے سے دفع نہ کرتا تو خانقاہیں، گرجے، معبد اور مسجدیں، جن میں کثرت سے اللہ کا نام لیا جاتا ہے، سب ڈھا دیے جاتے۔''

شریعت کی اصطلاح میں یہ جہاد[1] ہے اور اس کا حکم قرآن میں دو صورتوں کے لیے آیا ہے:

ایک، ظلم و عدوان کے خلاف،

دوسرے، اتمامِ حجت کے بعد منکرین حق کے خلاف۔

---

[1] جہاد کے معنی کسی جدوجہد میں پوری قوت صرف کر دینے کے ہیں۔ قرآن میں یہ تعبیر جس طرح اللہ کی راہ میں عام جدوجہد کے لیے استعمال ہوئی ہے، اسی طرح قتال فی سبیل اللہ کے لیے بھی جگہ جگہ آئی ہے۔ یہاں اس کا یہی دوسرا مفہوم پیش نظر ہے۔

پہلی صورت شریعت کا ابدی حکم ہے اور اس کے تحت جہاد اُسی مصلحت سے کیا جاتا ہے جو اوپر بیان ہوئی ہے۔ دوسری صورت کا تعلق شریعت سے نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے قانونِ اتمامِ حجت سے ہے جو اس دنیا میں ہمیشہ انھی لوگوں کے ذریعے سے روبہ عمل ہوتا ہے جنھیں اللہ تعالیٰ ''شہادت'' کے منصب پر فائز کرتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ حق کی ایسی گواہی بن جاتے ہیں کہ اس کے بعد کسی کے لیے اُس سے انحراف کی گنجایش باقی نہیں رہتی۔ انسانی تاریخ میں یہ منصب آخری مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی قوم بنی اسمٰعیل کو حاصل ہوا ہے:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا. (البقرہ ۲: ۱۴۳)

''اور اسی طرح ہم نے تمھیں ایک درمیان کی جماعت[۲] بنایا تاکہ تم دنیا کی قوموں پر حق کی شہادت دینے والے بنو اور پیغمبر تم پر یہ شہادت دے۔''

اس قانون کی رو سے اللہ کی حجت جب کسی قوم پر پوری ہو جاتی ہے تو اس کے منکرین پر اسی دنیا میں عذاب آ جاتا ہے۔ یہ عذاب آسمان سے بھی آتا ہے اور بعض حالات میں اہل حق کی تلواروں کے ذریعے سے بھی۔ پھر اس کے نتیجے میں منکرین لازماً مغلوب ہو جاتے ہیں اور اُن کی سرزمین پر حق کا غلبہ پوری قوت کے ساتھ قائم ہو جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی قوم کے اہل ایمان کی طرف سے اتمام حجت کے بعد یہی دوسری صورت پیش آئی۔ چنانچہ انھیں جس طرح ظلم وعدوان کے خلاف قتال کا حکم دیا گیا، اسی طرح اس مقصد کے لیے بھی تلوار اٹھانے کی ہدایت ہوئی۔ یہ خدا کا کام تھا جو انسان کے ہاتھوں سے انجام پایا۔ اسے ایک سنتِ الٰہی کی حیثیت سے دیکھنا چاہیے۔ انسانی اخلاقیات سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ 'يعذبهم الله بايديكم'[۳] (اللہ انھیں تمھارے ہاتھوں سے سزا دے گا) کے الفاظ میں یہی حقیقت بیان ہوئی ہے۔

ذیل میں ہم جہاد کی ان دونوں صورتوں سے متعلق قرآن کے نصوص کی وضاحت کریں گے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

جہاد کا اذن

اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا، وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرٌ، اَلَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ. (الحج ۲۲: ۳۹-۴۰)

''جن سے جنگ کی جائے، انھیں جنگ کی اجازت دی گئی، اس لیے کہ ان پر ظلم ہوا، اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر پوری قدرت رکھتا ہے۔ وہ جو اپنے گھروں سے ناحق نکال دیے گئے، صرف اس بات پر کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا رب اللہ ہے۔''

۲۔ اس معنی میں کہ تمھارے ایک طرف اللہ اور اس کا رسول اور دوسری طرف 'الناس' یعنی دنیا کی اقوام ہیں۔

۳۔ التوبہ ۹: ۱۴۔

یہ قرآن کی پہلی آیات ہیں جن میں مہاجرینِ صحابہ کو اس بات کی اجازت دی گئی کہ وہ اگر چاہیں تو جارحیت کے جواب میں جنگ کا اقدام کر سکتے ہیں۔ قرآن نے بتایا ہے کہ یہ وہ لوگ تھے جنھیں بالکل بے قصور محض اس جرم پر ان کے گھروں سے نکلنے کے لیے مجبور کر دیا گیا کہ وہ اللہ ہی کو اپنا رب قرار دیتے ہیں۔ قریش کے شدائد و مظالم کی پوری فرد قرار دادِ جرم، اگر غور کیجیے تو اس ایک جملے میں سمٹ آئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے وطن اور گھر در کو اس وقت تک چھوڑنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتا، جب تک اس کے لیے وطن کی سرزمین بالکل تنگ نہ کر دی جائے۔ 'بانھم ظلموا' کا اشارہ انھی مظالم کی طرف ہے اور قرآن نے انھی کی بنیاد پر مسلمانوں کو یہ حق دیا ہے کہ اب وہ جارحیت کے خلاف تلوار اٹھا سکتے ہیں۔

'الذین اخرجوا من دیارھم' کے جو الفاظ ان آیات میں آئے ہیں، ان سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ مسلمانوں کو جنگ کی اجازت ہجرت سے پہلے نہیں دی گئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اقتدار کے بغیر قتال لازماً فساد بن جاتا ہے، اس لیے انسانوں کی کسی جماعت کو اس کا حق اس وقت تک نہیں دیا جا سکتا، جب تک وہ کسی خطۂ ارض میں ایک باقاعدہ اور منظّم حکومت کی صورت اختیار نہ کر لیں۔ مکہ میں یہ چیز مسلمانوں کو حاصل نہیں ہوئی، لیکن ہجرت کے بعد جب میثاقِ مدینہ کے نتیجے میں یثرب کا اقتدار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو منتقل ہو گیا تو اس کے فوراً بعد جنگ کی اجازت دے دی گئی۔ اس میں شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کو اس وقت بھی مسلمانوں کی مدد پر پوری قدرت حاصل تھی، جب مکہ میں وہ بدترین مظالم کا ہدف بنائے گئے، مگر جنگ اس کے باوجود ممنوع رہی۔ یہاں تک کہ برسوں ستم جھیلنے اور ظلم اٹھانے کے بعد لوگ بالآخر گھروں سے نکلنے کے لیے مجبور ہو گئے۔ نصرتِ الٰہی کا جو ضابطہ سورۂ انفال میں بیان ہوا ہے[4]، اس کی رو سے سو کے مقابلے میں وہ اگر دس بھی ہوتے تو اس زمانے میں جنگ کا نتیجہ لازماً انھی کے حق میں نکلتا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ مدینہ ہجرت سے پہلے انھیں اس کی اجازت نہیں دی گئی؟ اس سوال پر جس پہلو سے بھی غور کیجیے، یہ حقیقت بالکل مبرہن ہو کر سامنے آ جاتی ہے کہ اس کا سبب یقیناً وہی ہے جو ہم نے اوپر بیان کیا ہے۔ انبیا علیہم السلام کی پوری تاریخ اسی حقیقت کی گواہی دیتی ہے۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں معلوم ہے کہ انھوں نے جہاد و قتال کے لیے اس وقت تک کوئی اقدام نہیں کیا، جب تک بنی اسرائیل کو مصر سے نکال کر اپنی حکومت کے تحت ایک آزاد علاقے میں منظّم نہیں کر لیا۔ مسیح علیہ السلام کی دعوت میں یہ مرحلہ نہیں آیا تو انھوں نے جہاد و قتال کا نام بھی نہیں لیا، درآں حالیکہ خود ان کے بقول وہ تورات کو منسوخ کرنے نہیں، بلکہ پورا کرنے کے لیے آئے تھے[5]، اور تورات کے بارے میں معلوم ہے کہ اس میں قتال کا حکم پوری صراحت کے ساتھ موجود ہے[6]۔ صالح، ہود، شعیب، لوط، ابراہیم اور نوح علیہم السلام جیسے جلیل القدر رسولوں کی سرگزشت بھی یہی بتاتی ہے۔ قرآنِ مجید کی مکیات اسی بنا پر اس ذکر سے خالی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ میں اقتدار حاصل نہ ہوتا تو انجیل کی طرح قرآن میں بھی قتال کی کوئی آیت نہ ہوتی۔ چنانچہ

۴؎ ۸: ۶۵-۶۶۔

۵؎ متی ۵: ۱۷-۱۸۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

یہ بالکل قطعی ہے کہ مسلمان اپنی انفرادی حیثیت میں آیاتِ قتال کے مخاطب ہی نہیں ہیں۔ حدود وتعزیرات کی طرح ان آیات کے مخاطب بھی ان کے حکمران ہیں اور اس معاملے میں کسی اقدام کا حق انھی کو حاصل ہے۔ سورۂ حج کی زیرِ بحث آیات میں 'اذن' کا لفظ اسی حقیقت پر دلالت کرتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ قتال سے متعلق پہلا مسئلہ جواز وعدمِ جواز کا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قریش کی طرف سے ظلم و عدوان کے باوجود زمانۂ رسالت میں سیاسی اقتدار کی جس شرط کے پورا ہو جانے کے بعد مسلمانوں کو اس کی اجازت دی، اس کے بغیر یہ اب بھی کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہوسکتا[7]۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی بنا پر فرمایا ہے:

انما الامام جنة ، یقاتل من ورائه و یتقی به . (بخاری، رقم ۲۹۵۷)	''مسلمانوں کا حکمران ان کی سپر ہے، قتال اسی کے پیچھے رہ کر کیا جاتا ہے اور لوگ اپنے لیے اُسی کی آڑ پکڑتے ہیں۔''

فقہا کا موقف بھی اس معاملے میں یہی ہے۔ ''فقہ السنۃ'' میں ہے:

النوع الثالث من الفروض الکفائیة ما یشترط فیه الحاکم ، مثل : الجهاد و اقامة الحدود ؛ فان هذه من حق الحاکم و حده؛ ولیس لای فرد ان یقیم الحد علی غیره . (۱۰/۳)	''کفایہ فرائض کی تیسری قسم وہ ہے جس میں حکمران کا ہونا لازم ہے، جیسے جہاد اور اقامتِ حدود، اس لیے کہ اس کا حق تنہا حکمران کو حاصل ہے۔ اس کے سوا کوئی شخص بھی یہ حق نہیں رکھتا کہ وہ کسی دوسرے پر حد قائم کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہو۔''

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

جہاد کا حکم

وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ، اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ .

۶؎ استثنا ۲۰: ۱-۲۰۔

۷؎ اس زمانے میں بعض لوگ اس کی تردید میں صلح حدیبیہ کے بعد قریش کے خلاف ابوبصیر رضی اللہ عنہ کی غارت گری سے استدلال کرنا چاہتے ہیں۔ یہ محض علم ونظر کا افلاس ہے۔ قرآنِ مجید نے سورۂ انفال (۸) کی آیت ۷۲ میں پوری صراحت کے ساتھ فرمایا ہے کہ جو لوگ ہجرت کر کے مدینہ منتقل نہیں ہو سکے، ان کے کسی معاملے کی کوئی ذمہ داری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ریاست مدینہ کے مسلمانوں پر عائد نہیں ہوتی۔ پھر یہی نہیں، بخاری کی روایت (رقم ۲۷۳۱) کے مطابق خود حضور نے ابوبصیر کے ان اقدامات پر یہ تبصرہ فرمایا ہے کہ 'ویل امه مسعر حرب لو کان له احد' (اس کی ماں پر آفت آئے، اسے کچھ ساتھی مل گئے تو جنگ کی آگ بھڑکا کر رہے

وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ وَ الْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ ، فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ، كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ . فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ . وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ، فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ . اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ، فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ، وَاتَّقُوا اللّٰهَ ، وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ . (البقرہ۲: ۱۹۰۔۱۹۴)

”اور اللہ کی راہ میں اُن لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑیں اور (اِس میں) کوئی زیادتی نہ کرو۔ بے شک، اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور انھیں جہاں پاؤ، قتل کرو اور وہاں سے نکالو، جہاں سے اُنھوں نے تمھیں نکالا ہے اور (یاد رکھو کہ) فتنہ قتل سے زیادہ بری چیز ہے۔ اور مسجد حرام کے پاس تم اُن سے خود پہل کر کے جنگ نہ کرو، جب تک وہ تم سے اُس میں جنگ نہ کریں۔ پھر اگر وہ جنگ چھیڑ دیں تو اُنھیں (بغیر کسی تردد کے) قتل کرو۔ اِس طرح کے منکروں کی یہی سزا ہے۔ لیکن وہ اگر (اپنے اِس انکار سے) باز آ جائیں تو اللہ بخشنے والا، مہربان ہے۔ اور تم اُن سے برابر جنگ کیے جاؤ، یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور (اِس سرزمین میں) دین اللہ ہی کا ہو جائے۔ لیکن وہ باز آ جائیں تو (جان لو کہ) اقدام صرف ظالموں کے خلاف ہی جائز ہے۔ ماہِ حرام کا بدلہ ماہِ حرام ہے اور (اِسی طرح) دوسری حرمتوں کے بدلے ہیں۔ لہٰذا جو تم پر زیادتی کریں، تم بھی اُن کی اس زیادتی کے برابر ہی اُنھیں جواب دو اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ اللہ اُن کے ساتھ ہے جو اُس کے حدود کی پابندی کرتے ہیں۔“

سورۂ حج میں قتال کی اجازت کے بعد اس کا حکم قرآن میں اصلاً انھی آیات میں بیان ہوا ہے۔ ان کے علاوہ قتال کا ذکر قرآن میں جہاں بھی آیا ہے، ان آیات کی تفصیل، تاکید، اور ان کے حکم پر عمل کے نتیجے میں پیدا ہونے والے بعض مسائل کی وضاحت ہی کے لیے آیا ہے[۸]۔ سورۂ بقرہ میں ان کا سیاق یہ ہے کہ مسلمانوں پر یہ بات جب واضح کی گئی کہ بیت اللہ کا حج اُن پر فرض ہے اور دینِ ابراہیمی کے اصلی وارث ہونے کی حیثیت سے یہ انھی کا حق بھی ہے کہ وہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی بنائی ہوئی اس مسجد کی طرف حج کی عبادت کے لیے سفر کریں تو ضروری ہوا کہ یہ بات بھی اُن پر واضح کر دی جائے کہ اس معاملے میں قریش اگر مزاحمت کا رویہ اختیار کریں تو انھیں کیا کرنا چاہیے۔ قرآن نے بتایا کہ اس صورت میں اللہ کا حکم یہ ہے کہ وہ تلوار سے اس مزاحمت کا خاتمہ کر دیں۔ آیات کا سیاق یہی ہے، لیکن قرآن نے بات یہاں ختم نہیں کی۔ اس نے اس کے ساتھ آیندہ جنگ کی ذمہ داری، اس کا جذبۂ محرکہ اور اس کے اخلاقی حدود، بلکہ غور کیجیے تو اس میں اقدام کی غایت بھی اس طرح بیان کر دی ہے کہ قتال کی وہ دونوں صورتیں، جن کا ذکر ہم نے تمہید میں کیا ہے، بالکل متعین ہو کر سامنے آ جاتی ہیں۔

گا)۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان اقدامات کے بارے میں آپ کی رائے کیا تھی۔

۸؎ جس طرح، مثال کے طور پر، اسی سورہ کی آیت ۲۴۴ میں۔

ہم یہاں ان مباحث کی تفصیل کریں گے۔

ذمہ داری کی نوعیت

پہلی بات جو ان آیات سے واضح ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ ان میں صرف اتنی بات نہیں کہی گئی کہ مسلمان حجِ بیت اللہ کی راہ میں قریش کی مزاحمت ختم کرنے کے لیے تلوار اٹھا سکتے ہیں، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر انھیں حکم دیا گیا ہے کہ وہ اس مقصد کے لیے تلوار اٹھائیں اور برابر اٹھائے رکھیں، یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور سرزمینِ حرم میں دین صرف اللہ ہی کا ہو جائے۔ یہ ظاہر ہے کہ ایک بھاری ذمہ داری ہے اور مسلمانوں کے کسی نظمِ اجتماعی پر اُس کی حربی اور اخلاقی قوت کا لحاظ کیے بغیر نہیں ڈالی جا سکتی۔ چنانچہ سورۂ انفال میں قرآن نے وضاحت فرمائی ہے کہ اس کا لحاظ کیا گیا اور مختلف مراحل میں یہ اسی کے لحاظ سے کم یا زیادہ کر دی گئی۔

پہلے مرحلے میں جب مسلمانوں کی جماعت زیادہ تر مہاجرین و انصار کے سابقینِ اولین پر مشتمل تھی اور ایمان و اخلاق کے اعتبار سے اس میں کسی نوعیت کا کوئی ضعف نہ تھا، وہ دس کے مقابلے میں ایک کی قوت سے اس ذمہ داری کو پورا کرنے کے پابند تھے۔ ارشاد فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ، حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ، اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ وَ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ. (الانفال ۸: ۶۵)	’’اے نبی، ان اہلِ ایمان کو جہاد پر ابھارو۔ تم میں سے اگر بیس ثابت قدم ہوں گے تو وہ دو سو پر غالب آئیں گے، اور اگر سو ایسے ہوں گے تو ان کافروں کے ہزار پر بھاری رہیں گے، اس لیے کہ یہ بصیرت سے محروم لوگ ہیں۔‘‘

استاذ امام امین احسن اصلاحی اس بصیرت کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

’’یہی بصیرت انسان کا اصل جوہر ہے۔ اس بصیرت کے ساتھ جب مومن میدانِ جنگ میں نکلتا ہے تو وہ اپنے تنہا وجود کے اندر ایک لشکر کی قوت محسوس کرتا ہے، اس کو اپنے داہنے بائیں خدا کی نصرت نظر آتی ہے، موت اس کو زندگی سے زیادہ عزیز و محبوب ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہ اس کی بصیرت اس کے سامنے اس منزل کو روشن کر کے دکھا دیتی ہے جو اللہ کی راہ میں شہید ہونے والوں کے لیے مخصوص ہے۔ یہی بصیرت اس کے اندر وہ صبر و ثبات پیدا کرتی ہے جو اس کو تنہا اس بصیرت سے محروم دس آدمیوں پر بھاری کر دیتی ہے۔‘‘ (تدبرِ قرآن ۳/ ۵۰۶۔ ۵۰۷)

یہ پہلا مرحلہ تھا۔ اس کے بعد نئے لوگ اسلام میں داخل ہوئے۔ اس مرحلے میں مسلمانوں کی تعداد اگرچہ بہت بڑھ گئی، لیکن دین کی بصیرت کے لحاظ سے وہ سابقین اولین کے ہم پایہ نہیں رہے تو اللہ تعالیٰ نے اس ذمہ داری کا بوجھ بھی اُن پر ہلکا کر

دیااور فرمایا:

اَلْئٰنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَ عَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا ، فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ، وَ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفَيْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ، وَ اللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ . (الانفال ۸:۶۶)

''اب اللہ نے تمھارا بوجھ ہلکا کر دیا ہے اور جان لیا ہے کہ تم میں کمزوری آ گئی ہے۔لہٰذا تم میں سے اگر سو ثابت قدم ہوں گے تو دو سو پر غالب آئیں گے اور اگر ہزار ایسے ہوں گے تو اللہ کے حکم سے دو ہزار پر بھاری رہیں گے اور (حقیقت یہ ہے کہ) اللہ اُن لوگوں کے ساتھ ہے جو (اُس کی راہ میں) ثابت قدم رہیں۔''

یہی معاملہ مہمات کی ضرورت کے لحاظ سے بھی ہوا۔ بدر و احد اور تبوک وغیرہ کے مواقع پر ہر مسلمان کو اس ذمہ داری کا مکلّف ٹھیرایا گیا اور جن لوگوں نے اس مقصد کے لیے نکلنے میں کمزوری دکھائی ،انھیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے سخت محاسبے کا سامنا کرنا پڑا، یہاں تک کہ انھیں وعید سنائی گئی کہ وہ اگر اپنے اہل و عیال اور مال و منال کو اللہ کی راہ میں جہاد سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں تو انتظار کریں کہ اللہ اپنا فیصلہ صادر فرمائے اور انھیں بھی اسی انجام سے دوچار کر دے جو رسول کی تکذیب کرنے والوں کے لیے مقدر ہو چکا ہے[۹]۔ لیکن جن مہمات کے لیے سب مسلمانوں کے نکلنے کی ضرورت نہ تھی، اُن کے موقع پر اللہ تعالیٰ نے واضح فرما دیا کہ اب معاملہ درجۂ فضیلت حاصل کرنے کا ہے اور یہ درجۂ فضیلت اگرچہ کوئی معمولی چیز نہیں ہے، مگر جہاد کے لیے نکلنے کی ذمہ داری اس وقت تمام مسلمانوں پر عائد نہیں ہوتی:

لَا يَسْتَوِی الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِی الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ . فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً، وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ، وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ، دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَ مَغْفِرَةً وَّ رَحْمَةً. وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا. (النساء۴:۹۵-۹۶)

''مسلمانوں میں سے جو لوگ کسی معذوری کے بغیر گھر بیٹھے رہیں اور جو اللہ کی راہ میں اپنے جان و مال کے ساتھ جہاد کریں، دونوں برابر نہیں ہو سکتے ۔جان و مال کے ساتھ جہاد کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے بیٹھ رہنے والوں پر ایک درجہ فوقیت دی ہے۔ اور (یہ حقیقت ہے کہ) دونوں سے اللہ کا وعدہ اچھا ہے اور یہ بھی کہ مجاہدین کو بیٹھ رہنے والوں پر اللہ نے ایک بڑے اجر کی فضیلت عطا فرمائی ہے، اس کی طرف سے درجے بھی اور مغفرت بھی اور رحمت بھی۔ اور اللہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان ہے۔''

تاہم یہ بات قرآن نے دوسری جگہ پوری صراحت کے ساتھ بتا دی ہے کہ ایک مرتبہ میدان میں اترنے کے بعد بزدلی

---

۹ التوبہ ۹:۲۴۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

دکھانا اور پیٹھ دکھا کر بھاگ جانا کسی مسلمان کا شیوہ نہیں ہوسکتا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے اتنا بڑا گناہ قرار دیا ہے کہ اس پر جہنم کی وعید سنائی ہے۔ سورۂ انفال میں ہے:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْھُمُ الْاَدْبَارَ . وَ مَنْ یُّوَلِّھِمْ یَوْمَئِذٍ دُبُرَہٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَیِّزًا اِلٰی فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰہِ وَ مَاْوٰہُ جَھَنَّمُ وَ بِئْسَ الْمَصِیْرُ . (۸:۱۵۔۱۶)

''ایمان والو، جب تم ایک منظّم فوج کی صورت میں اِن کافروں کے مقابلے میں آ ؤ تو انھیں پیٹھ نہ دکھاؤ۔ اور (جان لو کہ) جس نے اس موقع پر پیٹھ دکھائی، الّا یہ کہ جنگ کے لیے پینترا بدلنا چاہتا ہو یا اپنی فوج کے کسی دوسرے حصے سے ملنا چاہتا ہو، تو وہ اللہ کا غضب لے کر لوٹا اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے، اور وہ نہایت برا ٹھکانا ہے۔''

استاذ امام ان آیات کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''اب یہ مسلمانوں کو آیندہ پیش آنے والی جنگوں سے متعلق ہدایت دی جا رہی ہے کہ جب منظّم فوج کشی کی شکل میں دشمن سے تمھارا مقابلہ ہو تو پیٹھ نہ دکھانا۔ یہ ہدایت اللہ تعالیٰ کی انھی تائیدات پر مبنی ہے جو اوپر مذکور ہوئی ہیں کہ جن کی پشت پر خدا اور اس کے فرشتے یوں مدد و نصرت کے لیے کھڑے ہوں، ان کے لیے حرام ہے کہ وہ اپنی پیٹھ دشمن کو دکھائیں۔

'ومن یولھم یومئذ دبرہ' ایسی صورت میں جو لوگ دشمن کو پیٹھ دکھائیں گے، فرمایا کہ وہ خدا کا غضب لے کر لوٹیں گے اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ جرم کفر و ارتداد کے برابر ہے۔ اس جرم کی یہ شدت، ظاہر ہے کہ اسی بنیاد پر ہے کہ جو شخص میدان جنگ سے بھاگتا ہے، وہ اپنی اس بزدلی سے بسا اوقات پوری فوج، بلکہ پوری ملت کے لیے ایک شدید خطرہ پیدا کر دیتا ہے۔

'الا متحرفا لقتال او متحیزا الی فئة'، یعنی اس سے مستثنیٰ وہ شکلیں ہیں جو کوئی سپاہی کسی جنگی تدبیر کے لیے اختیار کرتا ہے یا کوئی ایسی صورت اس کے سامنے آ گئی ہے کہ وہ اپنے ایک مورچے سے ہٹ کر اپنے ہی کسی دوسرے مورچے کی طرف سمٹنا چاہتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حرام جو چیز ہے، وہ فرار کی نوعیت کا پیٹھ دکھانا ہے۔ وہ پیچھے ہٹنا اس سے مستثنیٰ ہے جو تدبیر جنگ کی نوعیت کا ہو۔'' (تدبر قرآن ۳/ ۴۵۰۔۴۵۱)

قرآن کی ان تصریحات سے یہ تین باتیں بالکل متعین ہو کر سامنے آتی ہیں:

اول یہ کہ ظلم و عدوان کا وجود متحقق بھی ہو تو جہاد اس وقت تک فرض نہیں ہوتا، جب تک دشمن کے مقابلے میں مسلمانوں کی حربی قوت ایک خاص حد تک نہ پہنچ جائے۔ سابقینِ اولین کے ساتھ دوسرے لوگوں کی شمولیت کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ حد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے ہی میں دو کے مقابلے میں ایک مقرر کر دی تھی۔ بعد کے زمانوں میں یہ تو متصور نہیں ہوسکتا کہ یہ اس سے زیادہ ہوسکتی ہے، لہٰذا مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ جہاد و قتال کی اس ذمہ داری کو پورا کرنے کے لیے نہ صرف یہ کہ اپنے اخلاقی وجود کو محکم رکھنے کی کوشش کریں، بلکہ اپنی حربی قوت بھی اس درجے تک لازماً بڑھائیں جس کا حکم قرآن نے

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

زمانۂ رسالت کے مسلمانوں کو اس وقت کی صورت حال کے لحاظ سے دیا تھا:

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَ اٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ، اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ، وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ . (الانفال ۸:۶۰)

”اور اِن کافروں کے لیے، جس حد تک ممکن ہو، حربی قوت اور بندھے ہوئے گھوڑے تیار رکھو جس سے اللہ کے اور تمھارے ان دشمنوں پر تمھاری ہیبت رہے اور ان کے علاوہ اُن دوسروں پر بھی جنھیں تم نہیں جانتے، (لیکن) اللہ انھیں جانتا ہے اور (جان رکھو کہ) اللہ کی اِس راہ میں تم جو کچھ بھی خرچ کرو گے، وہ تمھیں پورا مل جائے گا اور تمھارے ساتھ کوئی کمی نہ ہوگی۔“

دوم یہ کہ جہاد میں عملاً حصہ نہ لینا صرف اُس صورت میں جرم ہے، جب کوئی مسلمان نفیر عام[۱۰] کے باوجود گھر میں بیٹھا رہے، اُس وقت یہ بے شک نفاق جیسا بڑا جرم بن جاتا ہے۔ یہ صورت نہ ہو تو جہاد ایک فضیلت ہے جس کے حصول کا جذبہ ہر شخص میں ہونا چاہیے، لیکن اس کی حیثیت ایک درجۂ فضیلت ہی کی ہے۔ یہ ان فرائض میں سے نہیں ہے کہ جنھیں پورا نہ کیا جائے تو آدمی مجرم قرار پائے۔

سوم یہ کہ قتال فی سبیل اللہ کے لیے میدان میں اترنے کے بعد بزدلی اور فرار کی نوعیت کا پیٹھ دکھانا حرام ہے۔ کسی صاحبِ ایمان کو ہرگز اس کا ارتکاب نہیں کرنا چاہیے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی نصرت پر بے اعتمادی، دنیا کی آخرت پر ترجیح اور موت و حیات کو اپنی تدبیر پر منحصر قرار دینے کا جرم ہے جس کی ایمان کے ساتھ کوئی گنجایش نہیں مانی جا سکتی۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

جذبۂ محرکہ

دوسری بات جو ان آیات سے واضح ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ جس قتال کا حکم ان میں دیا گیا ہے، وہ نہ خواہشِ نفس کے لیے ہے، نہ مال و دولت کے لیے، نہ ملک کی تسخیر اور زمین کی حکومت کے لیے، نہ شہرت و ناموری کے لیے اور نہ حمیت و حمایت اور عصبیت یا عداوت کے کسی جذبے کی تسکین کے لیے۔ وہ، جس طرح کہ 'قاتلوا' کے بعد 'فی سبیل اللّٰه' کی قید سے ظاہر ہے، محض اللہ کے لیے ہے۔ قرآن نے یہ بات حکم کی ابتدا ہی میں پوری صراحت کے ساتھ بیان کر دی ہے کہ انسان کی خودغرضی اور نفسانیت کا اس قتال کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ اللہ کی جنگ ہے جو اُس کے بندے، اس کے حکم پر اور اس کی ہدایت کے مطابق 'فی سبیل اللّٰه'، یعنی اس کی راہ میں لڑتے ہیں۔ اُن کی حیثیت اس جنگ میں محض آلات و جوارح کی ہے۔ اس میں اُن کو اپنا کوئی مقصد نہیں، بلکہ خدا کے مقاصد پورے کرنا ہوتے ہیں۔ لہٰذا وہ اپنی اس حیثیت سے سرِ مو کوئی

۱۰؎ یعنی ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ اربابِ حل و عقد ہر مسلمان کو جہاد کے لیے طلب کر لیں۔

انحراف نہیں کر سکتے۔

سورۂ نساء میں ارشاد ہوا ہے:

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ ، فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ ، اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا . (۴:۷۶)

''جو لوگ ایمان لائے ہیں، وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں اور جو منکر ہیں وہ شیطان کی راہ میں لڑتے ہیں۔ لہٰذا تم بھی شیطان کے ان دوستوں سے لڑو۔ اس میں شبہ نہیں کہ شیطان کی چال ہر حال میں بودی ہوتی ہے۔''

قرآن کا یہ منشا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بعض مواقع پر نہایت خوبی کے ساتھ واضح فرمایا ہے۔

ابوموسیٰ اشعری کا بیان ہے کہ ایک شخص حضور کی خدمت میں حاضر ہوا اور پوچھا کہ کوئی مالِ غنیمت حاصل کرنے کے لیے لڑتا ہے، کوئی شہرت اور ناموری کے لیے لڑتا ہے، کوئی اپنی بہادری دکھانے کے لیے لڑتا ہے، فرمایئے کہ ان میں سے کس کی لڑائی اللہ کی راہ میں ہے؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ اللہ کی راہ میں لڑائی تو صرف اس کی ہے جو محض اللہ کا بول بالا کرنے کے لیے میدان میں اترے۔[11]

ابوامامہ باہلی روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور عرض کی: اس شخص کے بارے میں فرمایئے جو مالی فائدے اور ناموری کے لیے جنگ کرتا ہے، اُسے کیا ملے گا؟ آپ نے جواب دیا: اُسے کچھ بھی حاصل نہ ہو گا۔ اُس شخص نے تین مرتبہ یہی بات پوچھی اور آپ نے یہی جواب دیا، یہاں تک کہ فرمایا: اللہ تعالیٰ کوئی عمل بھی اُس وقت تک قبول نہیں کرتا، جب تک وہ خالص نہ ہو اور اُس کی رضامندی کے لیے نہ کیا جائے۔[12]

ابوہریرہ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضور نے فرمایا: قیامت کے دن سب سے پہلے تین قسم کے آدمیوں کا فیصلہ ہوگا: پہلے اُس شخص کا جو لڑ کر شہید ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ اسے اپنی نعمتیں یاد دلائے گا۔ وہ اُن کا اقرار کر لے گا تو اللہ پوچھے گا: تو نے میرے لیے کیا کیا؟ وہ کہے گا: میں نے تیرے لیے جنگ کی، یہاں تک کہ شہید ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تو نے جھوٹ بولا، تو نے تو اس لیے جنگ کی تھی کہ لوگ تیری بہادری کا اعتراف کریں، سو یہ ہو گیا۔ پھر اللہ تعالیٰ اُس کے لیے عذاب کا حکم فرمائے گا اور اُسے منہ کے بل گھسیٹ کر دوزخ میں ڈال دیا جائے گا۔[13]

عبادہ بن صامت بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: جو شخص اللہ کی راہ میں جنگ کے لیے نکلا اور اس

۱۱؎ بخاری، رقم ۲۸۱۰۔

۱۲؎ نسائی، رقم ۳۱۴۰۔

۱۳؎ نسائی، رقم ۳۱۳۷۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

میں اونٹ باندھنے کی ایک رسی کی نیت بھی کر لی تو اسے صرف وہ رسی ملے گی۔ اس کے سوا کچھ بھی حاصل نہ ہوگا۔[۱۴]

معاذ بن جبل کا بیان ہے کہ ایک موقع پر آپ نے فرمایا: لڑائیاں دو قسم کی ہیں: جس نے خالص اللہ کی رضا جوئی کے لیے لڑائی کی اور اس میں اپنے حکمران کی اطاعت کی، اپنا بہترین مال خرچ کیا، اپنے ساتھیوں کے ساتھ نرمی کا رویہ اختیار کیا اور فساد سے اجتناب کیا تو اس کا سونا جاگنا، سب باعثِ اجر ہوگا اور جس نے دنیا کو دکھانے اور شہرت اور ناموری کے لیے تلوار اٹھائی اور اس میں اپنے حکمران کی نافرمانی کی اور اس طرح زمین میں فساد پھیلایا تو وہ برابر بھی نہ چھوٹے گا۔[۱۵]

اس قتال کی یہی نوعیت ہے جس کی بنا پر اس کا اجر بھی نہایت غیر معمولی بیان ہوا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ، بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ . فَرِحِيْنَ بِمَا اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَ يَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَاهُمْ يَحْزَنُوْنَ . يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَضْلٍ ، وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ .
(آلِ عمران ۳: ۱۶۹۔۱۷۱)

’’اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں، انھیں مردہ خیال نہ کرو۔ (وہ مردہ نہیں)، بلکہ اپنے پروردگار کے حضور میں زندہ ہیں، انھیں روزی مل رہی ہے، اللہ نے جو کچھ اپنے فضل میں سے انھیں دیا ہے، اُس پر شاداں و فرحاں ہیں اور ان لوگوں کے بارے میں بشارت حاصل کر رہے ہیں جو اُن کے پیچھے رہ جانے والوں میں سے ابھی ان سے نہیں ملے کہ انھیں بھی نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غم زدہ ہوں گے۔ وہ اللہ کی نعمت اور اس کے فضل سے خوش وقت ہیں اور اس بات سے کہ اللہ اہلِ ایمان کا اجر ضائع نہ کرے گا۔‘‘

ابو ہریرہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص اللہ کی راہ میں جہاد کرتا ہے ـــــ اور اللہ خوب جانتا ہے کہ کون اس کی راہ میں جہاد کرنے والا ہے ـــــ اُس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی دن کو روزے رکھتا رہے اور رات کو نماز میں کھڑا رہے، اور اللہ نے اپنی راہ میں جہاد کرنے والوں کے لیے ذمہ لیا ہے کہ انھیں وفات دے گا تو سیدھا بہشت میں لے جائے گا، ورنہ اجر و ثواب اور مالِ غنیمت دے کر سلامتی کے ساتھ گھر لوٹا دے گا۔[۱۶]

انھی کا بیان ہے کہ ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: مجھے کوئی ایسا عمل بتایئے جو اجر و

۱۴؎ نسائی، رقم ۳۱۳۹۔

۱۵؎ نسائی، رقم ۳۱۸۸۔

۱۶؎ بخاری، رقم ۲۷۸۷۔

ثواب میں جہاد کے برابر ہو۔ آپ نے فرمایا: ایسا کوئی عمل نہیں ہے۔ پھر پوچھا: کیا یہ کر سکتے ہو کہ جب مجاہدین گھروں سے نکلیں تو مسجد میں جا کر برابر نماز میں کھڑے رہو، ذرا دم نہ لو اور برابر روزے رکھے جاؤ، کبھی افطار نہ کرو؟ اُس نے کہا: بھلا ایسا کون کر سکتا ہے۔[17]

یہی ابوہریرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: بہشت میں سو درجے ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے اپنی راہ میں جہاد کرنے والوں کے لیے تیار کیا ہے، ان میں سے ہر دو درجوں میں اتنا فاصلہ ہے، جتنا زمین و آسمان میں ہے۔[18]

انھی کی روایت ہے کہ حضور نے فرمایا: اُس پروردگار کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اللہ کی راہ میں جو شخص بھی زخمی ہوا ــــ اور اللہ خوب جانتا ہے کہ کون فی الواقع اس کی راہ میں زخمی ہوا ہے ــــ وہ قیامت کے دن اس طرح آئے گا کہ رنگ تو خون کا رنگ ہو گا اور خوشبو مشک کی ہو گی۔[19]

ابنِ جبر کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس بندے کے پاؤں اللہ کی راہ میں غبار آلود ہوئے، اسے دوزخ کی آگ چھوئے گی بھی نہیں۔[20]

سہل بن سعد کہتے ہیں کہ آپ کا ارشاد ہے: دشمن سے حفاظت کے لیے سرحد پر ایک دن کا قیام دنیا اور اس کی ہر چیز سے بہتر ہے۔[21]

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اخلاقی حدود

تیسری بات ان آیات سے یہ واضح ہوتی ہے کہ اللہ کی راہ میں یہ قتال اخلاقی حدود سے بے پروا ہو کر نہیں کیا جا سکتا۔ اخلاقیات ہر حال میں اور ہر چیز پر مقدم ہیں اور جنگ و جدال کے موقع پر بھی اللہ تعالیٰ نے ان سے انحراف کی اجازت کسی شخص کو نہیں دی۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ ان میں سے جو لڑنے کے لیے نکلیں، ان سے لڑو۔ جس شہر سے انھوں نے تمھیں نکالا ہے، تم بھی انھیں وہاں سے نکالو اور انھیں جہاں پاؤ، قتل کرو۔ ان کے ظلم و عدوان اور پیغمبر کی طرف سے اتمامِ حجت کے بعد یہ سب تمھارے لیے جائز ہے، لیکن دو باتیں اس کے باوجود لازماً ملحوظ رہنی چاہییں:

ایک یہ کہ کسی حرمت کے پامال کرنے میں پہل تمھاری طرف سے نہیں ہونی چاہیے۔ چنانچہ مسجدِ حرام کے پاس اور حرام

۱۷؎ بخاری، رقم ۲۷۸۵۔

۱۸؎ بخاری، رقم ۲۷۹۰۔

۱۹؎ بخاری، رقم ۲۸۰۳۔

۲۰؎ بخاری، رقم ۲۸۱۱۔

۲۱؎ بخاری، رقم ۲۸۹۲۔

مہینوں میں قتال اگر ہو سکتا ہے تو صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے، جب اس کی ابتدا ان کی طرف سے ہو جائے۔ تم اس معاملے میں اپنی طرف سے ابتدا ہرگز نہیں کر سکتے۔

دوم یہ کہ کسی زیادتی کا جواب تو اس زیادتی کے برابر تم انھیں دے سکتے ہو، لیکن آگے بڑھ کر اپنی طرف سے کوئی زیادتی کرنے کا حق تمھیں حاصل نہیں ہے۔ جنگ کرو، مگر اس میں تمھاری طرف سے کوئی زیادتی نہ ہو۔ یاد رکھو کہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو سخت ناپسند کرتا ہے اور اس کی مدد صرف اُن لوگوں کو پہنچتی ہے جو کسی حالت میں بھی اس کے حدود کی خلاف ورزی نہیں کرتے۔ زیر بحث آیات میں قرآن نے یہ دونوں باتیں اپنے بے مثل اسلوب میں اس طرح بیان فرمائی ہیں:

اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ، فَمَنِ اعْتَدٰی عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰی عَلَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ، وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ . (البقرہ۲: ۱۹۴)

''ماہِ حرام کا بدلہ ماہِ حرام ہے اور (اسی طرح) دوسری حرمتوں کے بدلے ہیں۔ لہٰذا جو تم پر زیادتی کریں، تم بھی اُن کی اس زیادتی کے برابر ہی انھیں جواب دو اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان لو کہ اللہ اُن کے ساتھ ہے جو اس کے حدود کی پابندی کرتے ہیں۔''

استاذ امام اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''مطلب یہ ہے کہ اشہر حرم میں یا حدودِ حرم میں لڑائی بھڑائی ہے تو بہت بڑا گناہ، لیکن جب کفار تمھارے لیے اس کی حرمت کا لحاظ نہیں کرتے تو تمھیں بھی یہ حق حاصل ہے کہ قصاص کے طور پر تم بھی ان کو ان کی حرمت سے محروم کر دو۔ ہر شخص کی جان شریعت میں محترم ہے، لیکن جب ایک شخص دوسرے کی جان کا احترام نہیں کرتا، اس کو قتل کر دیتا ہے تو اس کے قصاص میں وہ بھی حرمت جان کے حق سے محروم کر کے قتل کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح اشہر حرم اور حدودِ حرم کا احترام مسلم ہے، بشرطیکہ کفار بھی ان کا احترام ملحوظ رکھیں اور ان میں دوسروں کو ظلم و ستم کا ہدف نہ بنائیں، لیکن جب ان کی تلواریں ان مہینوں میں اور اس بلد امین میں بے نیام ہوتی ہیں تو وہ سزاوار ہیں کہ ان کے قصاص میں وہ بھی ان کے امن و احترام کے حقوق سے محروم کیے جائیں۔ مزید فرمایا کہ جس طرح اشہر حرم کا یہ قصاص ضروری ہے، اسی طرح دوسری حرمتوں کا قصاص بھی ہے۔ یعنی جس محترم چیز کے حقوقِ حرمت سے وہ تمھیں محروم کریں، تم بھی اس کے قصاص میں اس کے حق حرمت سے انھیں محروم کرنے کا حق رکھتے ہو۔ پس جس جس طرح کے اقدامات حرم اور اشہر حرم کی حرمتوں کو برباد کر کے وہ تمھارے خلاف کریں، تم ان کا جواب ترکی بہ ترکی دو۔ البتہ، تقویٰ کے حدود کا لحاظ رہے۔ کسی حد کے توڑنے میں تمھاری طرف سے پیش قدمی نہ ہو اور نہ کوئی اقدام حدِ ضروری سے زائد ہو۔ اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت انھی لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو ہر طرح کے حالات میں اس سے ڈرتے رہتے ہیں۔'' (تدبر قرآن ۱/۴۷۹-۴۸۰)

اس حکم کے ذیل میں جو سب سے اہم ہدایت قرآن میں بیان ہوئی ہے، وہ عہد کی پابندی کی ہے۔ غدر اور نقضِ عہد کو اللہ تعالیٰ نے بدترین گناہ قرار دیا ہے اور قتال کی دونوں ہی صورتوں میں، خواہ وہ ظلم و عدوان کے خلاف ہو یا اتمامِ حجت کے بعد

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

منکرینِ حق کے خلاف، مسلمانوں پر واضح کر دیا گیا ہے کہ وہ کسی قوم کے ساتھ کیے گئے معاہدے کی خلاف ورزی نہیں کر سکتے۔ سورۂ توبہ منکرینِ حق پر عذاب کی سورہ ہے اور اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کو مشرکینِ عرب کے ساتھ تمام معاہدات ختم کر کے آخری اقدام کا حکم دیا گیا ہے، لیکن اتنی بات اس میں بھی پوری صراحت کے ساتھ واضح کر دی گئی ہے کہ کوئی معاہدہ اگر وقت کی قید کے ساتھ کیا گیا ہے تو اس کی مدت لازماً پوری کی جائے گی[۲۲]۔ اسی طرح انفال میں صاف بتا دیا گیا ہے کہ کوئی معاہد قوم اگر مسلمانوں پر ظلم بھی کر رہی ہو تو معاہدے کی خلاف ورزی کر کے ان کی مدد نہیں کی جا سکتی۔ ارشاد فرمایا ہے:

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَایَتِهِمْ مِّنْ شَیْءٍ حَتّٰی یُهَاجِرُوْا، وَ اِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِی الدِّیْنِ فَعَلَیْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰی قَوْمٍ بَیْنَكُمْ وَ بَیْنَهُمْ مِّیْثَاقٌ، وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ. (۸:۷۲)

''رہے وہ لوگ جو ایمان لے آئے ہیں، مگر انھوں نے ہجرت نہیں کی تو ان سے تمھارا کوئی رشتۂ ولایت نہیں ہے، جب تک وہ ہجرت کر کے نہ آ جائیں۔ اور اگر وہ دین کے معاملے میں تم سے مدد چاہیں تو ان کی مدد کرنا تم پر لازم ہے، لیکن کسی ایسی قوم کے خلاف نہیں جس کے ساتھ تمھارا معاہدہ ہو۔ اور (حقیقت یہ ہے کہ) جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔''

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی عہد شکنی کی شناعت متعدد مواقع پر بیان فرمائی ہے:

ابوسعید کی روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: ہر غدار اور عہد شکن کی غداری کا اعلان کرنے کے لیے قیامت کے دن اس کی غداری کے بہ قدر ایک جھنڈا نصب کیا جائے گا، اور یاد رکھو کہ لوگوں کا سربراہ غداری اور عہد شکنی کا مرتکب ہو تو اس سے بڑا کوئی غدار نہیں ہے[۲۳]۔

عبداللہ بن عمرو بیان کرتے ہیں کہ حضور نے فرمایا: جو کسی معاہد کو قتل کرے گا، اسے جنت کی بو تک نصیب نہ ہو گی، درا ں حالیکہ اس کی بو چالیس برس کی مسافت سے بھی محسوس ہوتی ہے[۲۴]۔

تاہم اگر دوسری طرف سے خیانت کا اندیشہ ہو تو یہ حق مسلمانوں کو بے شک، حاصل ہے کہ وہ بھی قرآن کے الفاظ میں اس معاہدے کو 'علی سواء' اُن کے منہ پر پھینک ماریں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِیَانَةً فَانْۢبِذْ اِلَیْهِمْ عَلٰی سَوَآءٍ، اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْخَآئِنِیْنَ. (الانفال ۸:۵۸)

''پھر اگر کسی قوم سے بدعہدی کا اندیشہ ہو تو تم بھی برابری کے ساتھ علانیہ اُس کا عہد اس کے آگے پھینک دو۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ بدعہدی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

استاذ امام نے اس کی وضاحت میں لکھا ہے:

''علی سواء' کا مفہوم یہ ہے کہ انھی کے برابر کا اقدام تم بھی کرنے کے مجاز ہو۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ اینٹ کا جواب پتھر سے نہیں دینا چاہیے، بلکہ جواب ہم وزن ہونا چاہیے۔ بعض لوگوں نے اس سے یہ لازم قرار دیا ہے کہ ختم معاہدہ کی اطلاع فریق ثانی کو دے دینی چاہیے، ان کی اس بات کی کوئی دلیل ان الفاظ میں مجھے نظر نہیں آتی۔ البتہ، یہ بات مستنبط ہوتی ہے کہ محض فرضی اندیشہ کسی معاہدے کو کالعدم قرار دینے کے لیے کافی نہیں ہے، بلکہ عملاً اس کی خلاف ورزی کا اظہار ہوا ہو۔ اول تو یہاں 'تخافن' کا جو فعل استعمال ہوا ہے، اس میں خود تاکید ہے۔ دوسرے 'علی سواء' کی قید بھی اس کو نمایاں کر رہی ہے۔'' (تدبر قرآن ۳/۴۹۹)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی بات اس طرح واضح فرمائی ہے:

من كان بينه و بين قوم عهد فلا يحلن عهداً ولا يشدنه حتى يمضي امده او ينبذ اليهم على سواء. (ترمذی، رقم ۱۵۸۰)

''جس کا کسی قوم سے معاہدہ ہو، وہ اس کی مدت گزر جانے تک اس میں کوئی تغیر و تبدل نہ کرے، یا پھر خیانت کا اندیشہ ہو تو اسے برابری کے ساتھ علانیہ اس کے آگے پھینک دے۔''

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اس کے علاوہ جو ہدایات قرآن و حدیث میں بیان ہوئی ہیں، وہ یہ ہیں:

۱۔ جنگ کے لیے نکلتے وقت تکبر اور نمایش کا رویہ اختیار نہ کیا جائے۔ سورۂ انفال میں قرآن نے جہاں مسلمانوں کو تاکید فرمائی ہے کہ وہ اس طرح کے موقعوں پر اللہ کو بہت یاد کریں، وہاں یہ نصیحت بھی کی ہے کہ وہ اُن لوگوں کی روش اختیار نہ کریں جو اپنی کثرتِ تعداد اور اسباب و وسائل کی بہتات کا غرور دکھاتے ہوئے جنگ کے لیے نکلتے ہیں۔ فرمایا ہے کہ یہ طنطنہ اور طمطراق کسی بندۂ مومن کے شایانِ شان نہیں ہے۔ رزم ہو یا بزم، خدا کے بندوں پر عبدیت کی تواضع اور فروتنی ہر حال میں نمایاں رہنی چاہیے۔ اس لیے کہ اُن کی جنگ محض جنگ نہیں، بلکہ اللہ کی عبادت ہے اور ضروری ہے کہ اس کی یہ شان ہر جگہ قائم رہے:

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَآءَ النَّاسِ وَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ، وَاللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ. (۸:۴۷)

''اور ان لوگوں کی طرح نہ بننا جو اپنے گھروں سے اتراتے اور لوگوں کو اپنی شان دکھاتے ہوئے نکلے اور جن کا طریقہ یہ ہے کہ اللہ کے رستے سے روکتے ہیں، دراں حالیکہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں، اللہ اس کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔''

۲۔ وہ لوگ جو جنگ کے موقع پر کسی وجہ سے غیر جانب دار رہنا چاہتے ہوں، ان کے خلاف کوئی اقدام نہ کیا جائے۔ سورۂ نساء میں اُن مسلمانوں کا معاملہ زیرِ بحث آیا ہے جو اپنی کمزوری اور پست ہمتی کی وجہ سے نہ اپنی قوم کے ساتھ مل کر مسلمانوں سے

جنگ کرنے کے لیے تیار تھے اور نہ مسلمانوں میں شامل ہو کر اپنی قوم سے لڑنے کے لیے تیار تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان کے خلاف کوئی اقدام نہیں ہونا چاہیے:

اَوْ جَآءُ وْكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ اَنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ اَوْ يُقَاتِلُوْا قَوْمَهُمْ ، وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ فَلَقٰتَلُوْكُمْ ، فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ ، فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا. (۴:۹۰)

''یا وہ لوگ جو اس طرح تمھارے پاس آئیں کہ نہ تم سے لڑنے کی ہمت پا رہے ہوں نہ اپنی قوم سے، اور (ایسے ہیں کہ) اگر اللہ چاہتا تو ان کو تم پر دلیر کر دیتا اور وہ تم سے لڑتے۔ لہٰذا وہ اگر الگ رہیں اور تم سے جنگ نہ کریں اور تمھاری طرف صلح کا ہاتھ بڑھائیں تو اللہ تمھیں ان کے خلاف کسی اقدام کی اجازت نہیں دیتا۔''

۳۔ اُن لوگوں کو قتل نہ کیا جائے جو عقلاً و عرفاً جنگ میں حصہ نہیں لے سکتے یا نہیں لیا کرتے۔ عبد اللہ بن عمر کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ جنگ کے موقع پر جب یہ معلوم ہوا کہ ایک عورت قتل کر دی گئی ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں اور بچوں کے قتل سے لوگوں کو سختی کے ساتھ منع کر دیا۔[۲۵]

۴۔ دشمن کو آگ میں جلا کر نہ مارا جائے۔ ابو ہریرہ نے بیان کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ ہم لوگوں کو لڑائی پر جانے کا حکم دیا تو ہدایت کی کہ فلاں دو آدمی ملیں تو انھیں جلا دینا، مگر جب ہم روانہ ہونے لگے تو بلا کر فرمایا: میں نے تمھیں حکم دیا تھا کہ فلاں اور فلاں کو آگ میں جلا دینا، لیکن صحیح بات یہ ہے کہ آگ کا عذاب صرف اللہ ہی دے سکتا ہے، اس لیے اگر یہ لوگ تمھیں ملیں تو انھیں قتل کر دیا جائے۔[۲۶]

۵۔ لوٹ مار نہ کی جائے۔ عبد اللہ بن یزید بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے منع فرمایا کہ دشمن کے ملک میں پیش قدمی کرتے ہوئے عام لوگوں کی کوئی چیز چھین لی جائے۔[۲۷] ایک انصاری کی روایت ہے کہ جہاد کے سفر میں ایک مرتبہ اہل لشکر نے شدید ضرورت کے تحت کچھ بکریاں لوٹ لیں اور ان کا گوشت پکا کر کھانا چاہا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ہوئی تو آپ نے دیگچیاں الٹ دیں اور فرمایا: لوٹ کا مال مردار سے بہتر نہیں ہے۔[۲۸]

---

۲۲ ۹:۴۔

۲۳ مسلم، رقم ۱۷۳۸۔

۲۴ بخاری، رقم ۳۱۶۶۔

۲۵ بخاری، رقم ۳۰۱۵۔

۲۶ بخاری، رقم ۳۰۱۶۔

۲۷ بخاری، رقم ۲۴۷۴۔

۲۸ ابوداؤد، رقم ۲۷۰۵۔

۶۔مثلہ نہ کیا جائے۔ بریدہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فوجوں کو بھیجتے وقت جو ہدایات دیا کرتے تھے،اُن میں یہ بات بھی بڑی تاکید کے ساتھ فرماتے تھے کہ لاشوں کی بے حرمتی اور اُن کے اعضا کی قطع و برید نہیں ہونی چاہیے۔[29]

۷۔راستے تنگ نہ کیے جائیں۔معاذ بن انس کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں جہاد کے لیے نکلے تو دیکھا کہ لوگوں نے اترنے کی جگہ تنگ کر رکھی ہے اور راہ گیروں کو لوٹ رہے ہیں۔حضور کے پاس اس کی شکایت پہنچی تو آپ نے فوراً منادی کرادی کہ جو اترنے کی جگہ تنگ کرے گا یا راہ گیروں کو لوٹے گا،اس کا کوئی جہاد نہیں ہے۔[30]

اقدام کی غایت

چوتھی بات اقدام کی غایت ہے۔سورۂ بقرہ کی ان آیات میں پوری صراحت کے ساتھ بتا دیا گیا ہے کہ جنگ اس وقت تک جاری رہے گی،جب تک یہ دو مقاصد بالکل آخری درجے میں حاصل نہیں ہو جاتے:

ایک یہ کہ فتنہ باقی نہ رہے۔

دوسرے یہ کہ سرزمینِ عرب میں دین صرف اللہ ہی کا ہو جائے۔

پہلے مقصد کے لیے قرآن میں 'حتی لا تکون فتنة' کے الفاظ آئے ہیں۔سورۂ انفال (۸) کی آیت ۳۹ میں بھی جنگ کا یہ مقصد کم و بیش انھی الفاظ میں بیان ہوا ہے۔یہ 'فتنة' جسے قرآن نے یہاں 'اشد من القتل' (قتل سے بھی بڑا جرم) قرار دیا ہے،اس کے معنی کسی شخص کو ظلم و جبر کے ساتھ اس کے مذہب سے برگشتہ کرنے کی کوشش کے ہیں۔یہی چیز ہے جسے انگریزی زبان میں 'Persecution' کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔قرآن میں یہ لفظ جگہ جگہ اس معنی میں استعمال ہوا ہے۔اس میں شبہ نہیں کہ یہ فی الواقع قتل سے بھی زیادہ سنگین جرم ہے۔اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا آزمایش کے لیے بنائی ہے اور اس میں انسانوں کو حق دیا ہے کہ وہ اپنے آزادانہ فیصلے سے جو دین اور جو نقطۂ نظر چاہیں اختیار کریں،لہٰذا کوئی شخص یا گروہ اگر دوسروں کو بالجبر ان کا دین چھوڑنے پر مجبور کرتا ہے تو یہ درحقیقت اس دنیا کے لیے اللہ تعالیٰ کی پوری اسکیم کے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔چنانچہ یثرب میں جب مسلمانوں کی منظم ریاست قائم ہو گئی تو انھیں حکم دیا گیا کہ اس سرزمین میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والوں کے لیے فتنہ کی جو حالت پیدا کر دی گئی ہے،اسے ختم کرنے کے لیے تلوار اٹھائیں اور اس وقت تک برابر اٹھائے رکھیں،جب تک یہ حالت باقی ہے۔سورۂ نساء میں یہ حکم قرآن نے نہایت مؤثر اسلوب میں اس طرح بیان فرمایا ہے:

---

[29] ابوداؤد،رقم ۲۶۱۳۔

[30] ابوداؤد،رقم ۲۶۲۹۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ : رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا وَ اجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا . اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ ، فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ ، اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا . (۴:۷۵۔۷۶)

”اور تمھیں کیا ہوگیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں اور ان بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کے لیے نہیں لڑتے جو فریاد کر رہے ہیں کہ خدایا، ہمیں اس ظالموں کی بستی سے نکال اور ہمارے لیے اپنے پاس سے ہم درد پیدا کر دے اور ہمارے لیے اپنے پاس سے مددگار پیدا کر دے۔ (تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ) جو لوگ ایمان لائے ہیں، وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں اور جو منکر ہیں وہ شیطان کی راہ میں لڑتے ہیں۔ لہٰذا تم بھی شیطان کے ان حامیوں سے لڑو۔ شیطان کی چال ہر حال میں بودی ہوتی ہے۔“

فتنہ کے خلاف جنگ کا یہ حکم قرآن میں بعض دوسرے مقامات پر بھی بیان ہوا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ دوسروں کو بالجبر ان کے مذہب سے برگشتہ کرنے کی روایت اب بڑی حد تک دنیا سے ختم ہوگئی ہے، لیکن انسان جب تک انسان ہے، نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کب اور کس صورت میں پھر زندہ ہو جائے۔ اس لیے قرآن کا یہ حکم قیامت تک کے لیے باقی ہے۔ اللہ کی زمین پر اس طرح کا کوئی فتنہ جب سر اٹھائے، مسلمانوں کی حکومت اگر اتنی قوت رکھتی ہو کہ وہ اس کا استیصال کر سکے تو اس پر لازم ہے کہ مظلوموں کی مدد کے لیے اٹھے اور اللہ کی اس راہ میں جنگ کا اعلان کر دے۔ مسلمانوں کے لیے قرآن کی یہ ہدایت ابدی ہے، اسے دنیا کا کوئی قانون بھی ختم نہیں کر سکتا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مذہبی جبر کے علاوہ ظلم و عدوان کی جو دوسری صورتیں ہو سکتی ہیں، ان کا حکم کیا یہ نہیں ہوگا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مسلمانوں کی جان و مال اور عقل و رائے کے خلاف ظلم و عدوان کی تمام صورتیں، درجہ بدرجہ اسی کے تحت سمجھنی چاہییں۔ چنانچہ سورۂ حجرات میں قرآن نے ہدایت فرمائی ہے کہ اہل ایمان کا کوئی گروہ اگر اپنے بھائیوں کے خلاف جارحیت کا ارتکاب کرے اور مصالحت کی کوششوں کے باوجود اس سے باز نہ آئے تو اس سے جنگ کرنی چاہیے:

وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ، فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ، فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا ، اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ . اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ، فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ، وَاتَّقُوا اللّٰهَ

”اور مسلمانوں کے دو گروہ اگر کبھی آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان صلح کراؤ۔ پھر اگر ان میں سے ایک دوسرے پر زیادتی کرے تو زیادتی کرنے والے سے جنگ کرو، یہاں تک کہ وہ اللہ کے فیصلے کی طرف لوٹ آئے۔ پھر اگر وہ لوٹ آئے تو فریقین کے درمیان انصاف کے ساتھ مصالحت کرا دو اور ٹھیک ٹھیک انصاف کرو، اس لیے کہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ.(۴۹: ۹-۱۰)

ہے۔ مسلمان تو ایک دوسرے کے بھائی ہیں، لہٰذا اپنے ان بھائیوں کے مابین صلح کراؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔‘‘

ان آیات میں جو حکم بیان ہوا ہے، اس کا خلاصہ درجِ ذیل ہے:

۱۔ مسلمانوں کے دو گروہ اگر کبھی آپس میں لڑ پڑیں تو دوسرے مسلمانوں کو اسے پرایا جھگڑا سمجھ کر اس سے الگ تھلگ نہیں بیٹھ رہنا چاہیے۔ اسی طرح یہ بات بھی ان کے لیے جائز نہیں ہے کہ حق اور ناحق کی تحقیق کیے بغیر محض خاندانی، قبائلی اور گروہی عصبیت کے جوش میں کسی کے حامی اور کسی کے مخالف بن جائیں۔ ان کے لیے صحیح رویہ یہ ہے کہ معاملے کو پوری طرح سمجھ کر فریقین کے درمیان مصالحت کی کوشش کریں۔

۲۔ اگر ایک فریق مصالحت پر راضی نہ ہو یا راضی ہو جانے کے بعد پھر ظلم وعدوان کا رویہ اختیار کرے تو مسلمانوں کا فرض ہے کہ طاقت رکھتے ہوں تو اپنی کسی منظّم حکومت کے تحت اس کے خلاف جنگ کریں، یہاں تک کہ وہ اس فیصلے کے سامنے سر جھکا دے جو مصالحت کرانے والوں نے فریقین کے سامنے رکھا ہے۔ قرآن نے اس فیصلے کو ’امر اللّٰہ‘ سے تعبیر کیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر کوئی فریق اس سے گریز کرے گا تو وہ گویا اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے جھکنے سے گریز کرے گا۔

۳۔ فریقین مصالحت پر آمادہ ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ان میں سے کسی کے ساتھ نہ بے جا رعایت کی جائے اور نہ کسی کو عدل کے خلاف دبایا جائے، بلکہ ٹھیک انصاف کے مطابق صلح کرائی جائے اور جس کا جو نقصان ہوا ہے، اسے پورا کرا دیا جائے۔

یہ حکم، ظاہر ہے کہ صرف اسی صورت سے متعلق ہے، جب مسلمانوں کی کوئی باقاعدہ حکومت موجود ہو جس کے تحت جنگ کی جا سکے۔ یہ صورت نہ ہو تو سیدنا حذیفہ کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت فرمائی ہے کہ ہر مسلمان کو اس فتنے سے بالکل الگ ہو جانا چاہیے:

قلت : فان لم یکن لھم جماعة و لا امام؟ قال : فاعتزل تلك الفرق کلھا: ولو ان تعض باصل شجرة حتی یدرکك الموت و انت علی ذلك.

’’میں نے پوچھا: پھر اگر مسلمانوں کا کوئی نظم اجتماعی اور کوئی حکمران نہ ہو؟ آپ نے فرمایا: اس صورت میں ان سب گروہوں سے بالکل الگ ہو جاؤ، اگرچہ تمھیں مرتے وقت تک کسی درخت کی جڑ ہی چبانی پڑے۔‘‘

(بخاری، رقم ۷۰۸۴)

دوسرے مقصد کے لیے بقرہ اور انفال، دونوں میں بالترتیب ’یکون الدین للّٰہ‘ اور ’یکون الدین کلہ للّٰہ‘ کی تعبیر اختیار کی گئی ہے۔ اس سے پہلے جنگ کا حکم ’قاتلوھم‘ کے الفاظ میں بیان ہوا ہے۔ سیاقِ کلام سے واضح ہے کہ اس میں ضمیر

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

منصوب کا مرجع مشرکینِ عرب ہیں، لہٰذا یہ بات تو بالکل قطعی ہے کہ ان الفاظ کے معنی یہاں اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتے کہ دین سرزمین عرب میں پورا کا پورا اللہ کے لیے ہو جائے۔ یہ مقصد دو ہی صورتوں میں حاصل ہو سکتا تھا: ایک یہ کہ دین حق کے سوا تمام ادیان کے ماننے والے قتل کر دیے جائیں۔ دوسرے یہ کہ انھیں ہر لحاظ سے زیردست بنا کر رکھا جائے۔ چنانچہ صلح و جنگ کے بہت سے مراحل سے گزر کر جب منکرین پوری طرح مغلوب ہو گئے تو بالآخر یہ دونوں ہی طریقے اختیار کیے گئے۔ مشرکین عرب اگر ایمان نہ لائیں تو انھیں ختم کر دینے کا حکم دیا گیا اور یہود و نصاریٰ کے بارے میں ہدایت کی گئی کہ ان سے جزیہ لے کر اور انھیں پوری طرح محکوم اور زیردست بنا کر ہی اس سرزمین پر رہنے کی اجازت دی جائے۔ ان میں سے، البتہ جو معاندین تھے انھیں جب ممکن ہوا قتل یا جلاوطن کر دیا گیا۔

ہم نے تمہید میں لکھا ہے کہ اس مقصد کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ نے جو اقدامات کیے اور انھیں قتال کا جو حکم دیا گیا، اس کا تعلق شریعت سے نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے قانونِ اتمام حجت سے ہے۔ اس کتاب میں جگہ جگہ اس قانون کی تفصیل کی گئی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حجت جب کسی قوم پر پوری ہو جاتی ہے تو منکرینِ حق پر اسی دنیا میں اللہ کا عذاب آ جاتا ہے۔ قرآن بتاتا ہے کہ عذاب کا یہ فیصلہ رسولوں کی طرف سے انذار، انذارِ عام، اتمامِ حجت اور اس کے بعد ہجرت و برأت کے مراحل سے گزر کر صادر ہوتا اور اس طرح صادر ہوتا ہے کہ آسمان کی عدالت زمین پر قائم ہوتی، خدا کی دینونت کا ظہور ہوتا اور رسول کے مخاطبین کے لیے ایک قیامتِ صغریٰ برپا ہو جاتی ہے۔ اس کی جو تاریخ قرآن میں بیان ہوئی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر بالعموم دو ہی صورتیں پیش آتی ہیں: ایک یہ کہ پیغمبر کے ساتھی بھی تعداد میں کم ہوتے ہیں اور اسے کوئی دارالہجرت بھی میسر نہیں ہوتا۔ دوسرے یہ کہ وہ معتد بہ تعداد میں اپنے ساتھیوں کو لے کر نکلتا ہے اور اس کے نکلنے سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ کسی سرزمین میں اس کے لیے آزادی اور تمکن کے ساتھ رہنے بسنے کا سامان کر دیتے ہیں۔ ان دونوں ہی صورتوں میں رسولوں سے متعلق خدا کی وہ سنت لازماً روبہ عمل ہو جاتی ہے جو قرآن میں اس طرح بیان ہوئی ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ یُحَآدُّوْنَ اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہٗٓ اُولٰٓئِکَ فِی الْاَذَلِّیْنَ . کَتَبَ اللّٰہُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیْ، اِنَّ اللّٰہَ قَوِیٌّ عَزِیْزٌ . (المجادلہ ۵۸: ۲۰-۲۱)

''بے شک، وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کر رہے ہیں، وہی ذلیل ہوں گے۔ اللہ نے لکھ رکھا ہے کہ میں غالب رہوں گا اور میرے رسول بھی۔ بے شک، اللہ قوی ہے، بڑا زبردست ہے۔''

پہلی صورت میں رسول کے قوم کو چھوڑ دینے کے بعد یہ ذلت اس طرح مسلط کی جاتی ہے کہ آسمان کی فوجیں نازل ہوتیں، ساف و حاصب کا طوفان اٹھتا اور ابر و باد کے لشکر قوم پر اس طرح حملہ آور ہو جاتے ہیں کہ رسول کے مخالفین میں سے کوئی بھی زمین پر باقی نہیں رہتا۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ قومِ نوح، قومِ لوط، قومِ صالح، قومِ شعیب اور اس طرح کی بعض دوسری قوموں کے ساتھ یہی معاملہ پیش آیا۔ اس سے مستثنیٰ صرف بنی اسرائیل رہے جن کے اصلاً توحید ہی سے وابستہ ہونے کی

وجہ سے سیدنا مسیح علیہ السلام کے ان کو چھوڑنے کے بعد ان کی ہلاکت کے بجائے ہمیشہ کے لیے مغلوبیت کا عذاب ان پر مسلط کر دیا گیا۔

دوسری صورت میں عذاب کا یہ فیصلہ رسول اور اس کے ساتھیوں کی تلواروں کے ذریعے سے نافذ کیا جاتا ہے۔ اس صورت میں قوم کو مزید کچھ مہلت مل جاتی ہے۔ رسول اس عرصے میں دارالہجرت کے مخاطبین پر اتمامِ حجت بھی کرتا ہے۔ اپنے اوپر ایمان لانے والوں کی تربیت اور تطہیر وتزکیہ کے بعد انھیں اس معرکۂ حق و باطل کے لیے تیار بھی کرتا ہے اور دارالہجرت میں اپنا اقتدار بھی اس قدر مستحکم کر لیتا ہے کہ اس کی مدد سے وہ منکرین کے استیصال اور اہلِ حق کی سرفرازی کا یہ معرکہ سر کر سکے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملے میں یہی دوسری صورت پیدا ہوئی۔ چنانچہ اتمامِ حجت کے بعد پہلے یہود مغلوب ہوئے۔ معاہدات کی وجہ سے انھیں تحفظ حاصل تھا، لہٰذا ان میں سے جس نے بھی نقضِ عہد کا ارتکاب کیا، اللہ کے رسول کو جھٹلانے کی یہ سزا اس پر نافذ کر دی گئی۔ بنوقینقاع کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر اور بنونضیر کو شام کی طرف جلاوطن کر دیا۔[۳۱] پھر خیبر پر حملہ کر کے وہاں بھی ان کی قوت توڑ دی گئی۔[۳۲] اس سے پہلے انھی کے لوگوں میں سے ابورافع اور کعب بن اشرف کو ان کے گھروں میں قتل کرا دیا گیا۔[۳۳] بنوقریظہ نے غزوۂ خندق کے موقع پر غداری کی۔[۳۴] احزاب کے دل بادل چھٹ گئے اور باہر سے کسی حملے کا خوف باقی نہیں رہا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً ان کا محاصرہ کر لیا۔ اس سے عاجز ہو کر انھوں نے درخواست کی کہ سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ ہمارے حق میں جو فیصلہ کریں، وہ ہمیں منظور ہے۔ اس پر سعد بالاتفاق حکم بنائے گئے۔ قرآن میں کوئی متعین سزا چونکہ اس وقت تک ان کے لیے بیان نہیں ہوئی تھی، اس لیے سعد رضی اللہ عنہ نے تورات کے مطابق فیصلہ کر دیا کہ بنوقریظہ کے بالغ مرد قتل کیے جائیں، عورتوں اور بچوں کو لونڈی غلام بنا لیا جائے اور ان کا مال مسلمانوں میں بانٹ دیا جائے۔[۳۵] سعد بن معاذ کا یہ فیصلہ نافذ کیا گیا اور اس کے مطابق ان کے تمام مرد قتل کر دیے گئے۔[۳۶] اس کے بعد کوئی قابلِ ذکر واقعہ ان سے متعلق نہیں ہوا، یہاں تک کہ سورۂ توبہ میں اللہ تعالیٰ کا حتمی فیصلہ ان کے بارے میں نازل ہو گیا۔ ارشاد فرمایا ہے:

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

۳۱؎ السیرۃ النبویہ، ابن ہشام ۳/ ۴۰-۴۲، ۱۵۱-۱۶۰۔

۳۲؎ السیرۃ النبویہ، ابن ہشام ۳/ ۲۵۵-۲۷۷۔

۳۳؎ السیرۃ النبویہ، ابن ہشام ۳/ ۴۳-۴۸، ۲۱۵-۲۱۷۔ الطبقات الکبریٰ، ابن سعد ۲/ ۲۸۔

۳۴؎ السیرۃ النبویہ، ابن ہشام ۳/ ۱۸۰-۱۸۲۔

۳۵؎ استثنا ۲۰: ۱۰-۱۴۔

۳۶؎ السیرۃ النبویہ، ابن ہشام ۳/ ۱۸۸-۱۸۹۔

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَايُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَايُحَرِّمُوْنَ مَاحَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍوَّهُمْ صَاغِرُوْنَ . (۹:۲۹)

''ان (اہل کتاب) سے جنگ کرو جو نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں، نہ قیامت کے دن کو مانتے ہیں، نہ اللہ اور اس کے رسول نے جو کچھ حرام ٹھیرایا ہے، اسے حرام ٹھیراتے ہیں اور نہ دین حق کو اپنا دین بناتے ہیں، (ان سے جنگ کرو) یہاں تک کہ وہ مغلوب ہو کر جزیہ ادا کریں اور ماتحت بن کر زندگی بسر کریں۔''

یہ حکم یہود و نصاریٰ، دونوں کے بارے میں تھا۔ اللہ کے آخری پیغمبر کی طرف سے اتمامِ حجت کے نتیجے میں عذابِ استیصال کا مستحق ہو جانے کے باوجود یہ ان کے لیے بڑی رعایت تھی جو ان کے اصلاً توحید ہی سے وابستہ ہونے کی وجہ سے ان کے ساتھ کی گئی، لیکن انھوں نے اس سے فائدہ نہیں اٹھایا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد ایک مرتبہ پھر غدر اور نقضِ عہد کا رویہ اختیار کرنا شروع کر دیا۔[۳۷] چنانچہ خیبر کے یہود اور نجران کے نصاریٰ، دونوں کو بالآخر سیدنا فاروق رضی اللہ عنہ نے ہمیشہ کے لیے جزیرہ نمائے عرب سے جلاوطن کر دیا اور اس طرح اللہ تعالیٰ کی وہ بات ان کے بارے میں پوری ہو گئی جو قرآن میں اس طرح بیان ہوئی ہے:

وَلَوْ لَآ اَنْ كَتَبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمُ الْجَلَآءَ لَعَذَّبَهُمْ فِى الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ عَذَابُ النَّارِ. (الحشر ۵۹:۳)

''اور اگر اللہ نے ان کے لیے جلاوطنی نہ لکھی ہوتی تو وہ دنیا ہی میں انھیں عذاب دے کر ان کا نام و نشان مٹا دیتا اور آخرت میں تو ان کے لیے دوزخ کا عذاب مقرر ہی ہے۔''

مشرکینِ عرب بھی جب اسی طرح مغلوب ہو گئے تو سورۂ توبہ میں اعلان کر دیا گیا کہ اب ان کے ساتھ آیندہ کوئی معاہدہ نہیں ہو گا اور ان کے لیے چار مہینے کی مہلت ہے، اس کے بعد رسوائی کا عذاب ان پر مسلط ہو جائے گا جس سے نکلنے کی کوئی راہ وہ اس دنیا میں نہ پا سکیں گے۔[۳۸] چنانچہ مکہ فتح ہوا اور جس طرح ان کے بعض معاندین بدر اور احد کے قیدیوں میں سے قتل کیے گئے تھے، اسی طرح اس موقع پر بھی قتل کر دیے گئے۔ اس سے پہلے سورۂ توبہ کا یہ حکم ان کے بارے میں نازل ہو چکا تھا کہ حج اکبر کے موقع پر اس بات کا اعلان کر دیا جائے کہ حرام مہینے گزر جانے کے بعد مسلمان ان مشرکین کو جہاں پائیں گے، قتل کر دیں گے، الّا یہ کہ وہ ایمان لائیں، نماز کا اہتمام کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ اس سے مستثنیٰ صرف وہ لوگ قرار دیے گئے جن کے ساتھ متعین مدت کے معاہدات تھے۔ ان کے بارے میں ہدایت کی گئی کہ اگر وہ کوئی خلاف ورزی نہیں کرتے تو ان معاہدات کی مدت تک انھیں پورا کیا جائے گا۔ اس کے صاف معنی یہ تھے کہ مدت پوری ہو جانے کے بعد یہ معاہدین بھی اسی انجام کو پہنچیں

۳۷؎ بخاری، رقم ۳۰۲۷۔ کتاب الخراج، ابو یوسف ۴۲۔ فتوح البلدان، البلاذری ۷۳۔ الکامل فی التاریخ، ابن الاثیر ۲/ ۱۱۲۔

۳۸؎ ۹: ۱۔۲۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

گے جو جزیرہ نماے عرب کے تمام مشرکین کے لیے مقدر کر دیا گیا ہے۔ ایمان نہ لانے کی صورت میں یہ ان کے قتلِ عام کا اعلان تھا جو قرآن میں اس طرح بیان ہوا ہے:

وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِيْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ وَرَسُوْلُهٗ، فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ، وَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ، اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـًٔا وَّ لَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ، اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ. فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ، فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ، اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ. (التوبہ ۹: ۳۔۵)

’’اور اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے حجِ اکبر کے دن لوگوں میں منادی کر دی جائے کہ اللہ ان مشرکوں سے بری الذمہ ہے اور اس کا رسول بھی۔ اس لیے اگر توبہ کر لو تو یہ تمھارے لیے بہتر ہے اور اگر روگردانی کرو گے تو جان لو کہ تم اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے، اور ان منکروں کو، (اے پیغمبر)، ایک دردناک عذاب کی بشارت دے دو۔ اس سے مستثنیٰ صرف وہ مشرکین ہیں جن سے تم لوگوں نے معاہدہ کیا اور انھوں نے اس میں نہ کوئی خیانت کی ہے اور نہ تمھارے خلاف کسی کی مدد کی ہے۔ سو ان کا معاہدہ ان کی قرارداده مدت تک پورا کرو۔ اللہ، یقیناً ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو حدود کی پابندی کرتے ہیں۔ پھر جب (حج کے بعد) حرام مہینے گزر جائیں تو ان مشرکوں کو جہاں پاؤ، قتل کرو، انھیں پکڑو، انھیں گھیرو اور ہر گھات میں ان کی تاک لگاؤ۔ ہاں، اگر یہ توبہ کر لیں اور نماز کا اہتمام کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو ان کی راہ چھوڑ دو۔ بے شک، اللہ بخشنے والا ہے، وہ سراسر رحمت ہے۔‘‘

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

ان اقدامات سے جنگ کا وہ مقصد تو بالکل آخری درجے میں پورا ہو گیا جو ’یکون الدین کله لله‘ کے الفاظ میں بیان ہوا ہے، لیکن اوپر بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قانونِ اتمامِ حجت کی رو سے یہ تمام اقدامات درحقیقت اس ’’شہادت‘‘ کا لازمی نتیجہ تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے عرب کے مشرکین اور یہود و نصاریٰ پر قائم ہوئی۔ قرآن نے بتایا ہے کہ شہادت کا یہ منصب سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی ذریت کو بھی اسی طرح حاصل تھا۔ لہٰذا آپ پر ایمان لانے کے بعد وہ جب ’’خیر امت‘‘[39] بن کر اٹھے تو ان کے ذریعے سے یہ جزیرہ نماے عرب سے باہر کی اقوام پر بھی قائم ہو گئی۔ قرآن نے صراحت کی ہے کہ ذریت ابراہیم کو اللہ تعالیٰ نے اس شہادت کے لیے اسی طرح منتخب کیا تھا، جس طرح وہ بنی آدم میں سے بعض جلیل القدر

۳۹؎ آلِ عمران ۳: ۱۱۰۔

ہستیوں کو نبوت و رسالت کے لیے منتخب کرتا ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

وَ جَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ، هُوَ اجْتَبٰكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ، مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ، هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَ فِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ . (الحج ۲۲:۷۸)

''اور اللہ کی راہ میں جدوجہد کرو، جیسا کہ اس جدوجہد کا حق ہے۔ اسی نے تم کو (اس ذمہ داری کے لیے) منتخب کیا اور دین کے معاملے میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔ تمھارے باپ ابراہیم کا طریقہ تمھارے لیے پسند فرمایا ہے۔ اس نے تمھارا نام مسلمان رکھا تھا، اس سے پہلے بھی اور اس (آخری بعثت کے دور) میں بھی۔ اس لیے (منتخب کیا ہے) کہ رسول تم پر گواہی دے اور دنیا کے باقی لوگوں پر تم (اس دین کی) گواہی دینے والے بنو۔''

صلح حدیبیہ کے بعد ان اقوام کا تعین نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سربراہوں کو خط لکھ کر کر دیا تھا۔ یہ خطوط جن اقوام کے سربراہوں کو لکھے گئے، ان کا علاقہ کم و بیش وہی ہے جسے تورات میں ذریت ابراہیم کی میراث کا علاقہ قرار دیا گیا ہے[۴۰]۔ چنانچہ جزیرہ نما میں اپنی حکومت مستحکم کر لینے کے بعد بنی اسمٰعیل کے اہل ایمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فیصلے کو نافذ کرنے کے لیے اس اعلان کے ساتھ ان اقوام پر حملہ آور ہو گئے کہ اسلام قبول کرو یا زیر دست بن کر جزیہ دینے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اس کے سوا اب زندہ رہنے کی کوئی صورت تمھارے لیے باقی نہیں رہی۔ ان میں سے کوئی قوم بھی اصلاً شرک کی علم بردار نہ تھی، ورنہ وہ اس کے ساتھ بھی وہی معاملہ کرتے جو مشرکین عرب کے ساتھ کیا گیا تھا۔

اس سے واضح ہے کہ یہ محض قتال نہ تھا، بلکہ اللہ تعالیٰ کا عذاب تھا جو اتمام حجت کے بعد سنت الٰہی کے عین مطابق اور ایک فیصلۂ خداوندی کی حیثیت سے پہلے عرب کے مشرکین اور یہود و نصاریٰ پر اور اس کے بعد عرب سے باہر کی اقوام پر نازل کیا گیا۔ لہٰذا یہ بالکل قطعی ہے کہ منکرین حق کے خلاف جنگ اور اس کے نتیجے میں مفتوحین پر جزیہ عائد کر کے انھیں محکوم اور زیردست بنا کر رکھنے کا حق ان اقوام کے بعد اب ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا ہے۔ قیامت تک کوئی شخص اب نہ دنیا کی کسی قوم پر اس مقصد سے حملہ کر سکتا ہے اور نہ کسی مفتوح کو محکوم بنا کر اس پر جزیہ عائد کرنے کی جسارت کر سکتا ہے۔ مسلمانوں کے لیے قتال کی ایک ہی صورت باقی رہ گئی ہے، اور وہ ظلم و عدوان کے خلاف جنگ ہے۔ اللہ کی راہ میں قتال اب یہی ہے۔ اس کے سوا کسی مقصد کے لیے بھی دین کے نام پر جنگ نہیں کی جا سکتی۔

---

[۴۰] ان سربراہوں کے نام یہ ہیں: ۱۔ نجاشی شاہِ حبش۔ ۲۔ مقوقس شاہِ مصر۔ ۳۔ خسرو پرویز شاہِ فارس۔ ۴۔ قیصر شاہِ روم۔ ۵۔ منذر بن ساوی حاکمِ بحرین۔ ۶۔ ہوذہ بن علی صاحبِ یمامہ۔ ۷۔ حارث بن ابی شمر حاکمِ دمشق۔ ۸۔ جیفر شاہِ عمان۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

نصرت الٰہی

یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ ، حَرِّضِ الْمُؤْمِنِیْنَ عَلَی الْقِتَالِ ، اِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ یَغْلِبُوْا مِائَتَیْنِ ، وَاِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ مِّائَۃٌ یَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِاَنَّھُمْ قَوْمٌ لَّا یَفْقَھُوْنَ . اَلْئٰنَ خَفَّفَ اللّٰہُ عَنْکُمْ وَ عَلِمَ اَنَّ فِیْکُمْ ضَعْفًا ، فَاِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ مِّائَۃٌ صَابِرَۃٌ یَّغْلِبُوْا مِائَتَیْنِ وَ اِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ اَلْفٌ یَّغْلِبُوْٓا اَلْفَیْنِ بِاِذْنِ اللّٰہِ ، وَاللّٰہُ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ . (الانفال ۸:۶۵-۶۶)

’’اے نبی، مسلمانوں کو جہاد پر ابھارو۔ اگر تمھارے بیس ثابت قدم ہوں گے تو دو سو پر غلبہ پا لیں گے اور اگر سو ایسے ہوں گے تو اِن کافروں کے ہزار پر بھاری رہیں گے، اِس لیے کہ یہ بصیرت نہیں رکھتے۔ اچھا، اب اللہ نے تمھارا بوجھ ہلکا کر دیا ہے اور جان لیا ہے کہ تم میں کمزوری آ گئی ہے۔ لہٰذا اگر تمھارے سو ثابت قدم ہوں گے تو دو سو پر غلبہ پائیں گے اور اگر ہزار ایسے ہوں گے تو اللہ کے حکم سے دو ہزار پر بھاری رہیں گے، اور (حقیقت یہ ہے کہ) اللہ اُن لوگوں کے ساتھ ہے جو (اُس کی راہ میں) ثابت قدم رہیں۔‘‘

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

سورۂ انفال کی یہ آیات جس طرح جہاد کے لیے ذمہ داری کی حد بیان کرتی ہیں، اسی طرح جہاد و قتال میں اللہ تعالیٰ کی نصرت کا ضابطہ بھی بالکل متعین کر دیتی ہیں۔ ان میں یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ جنگ میں نصرتِ الٰہی کا معاملہ اللّ ٹپ نہیں ہے کہ جس طرح لوگوں کی خواہش ہو، اللہ کی مدد بھی اسی طرح آ جائے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے ایک قاعدہ مقرر کر رکھا ہے اور وہ اسی کے مطابق اپنے بندوں کی مدد فرماتے ہیں۔ آیات پر تدبر کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ نصرتِ الٰہی کا یہ ضابطہ درجِ ذیل تین نکات پر مبنی ہے:

اول یہ کہ اللہ کی مدد کے لیے سب سے بنیادی چیز صبر و ثبات ہے۔ مسلمانوں کی کسی جماعت کو اس کا استحقاق اس وقت تک حاصل نہیں ہوتا، جب تک وہ یہ صفت اپنے اندر پیدا نہ کر لے۔ اس سے محروم کوئی جماعت اگر میدانِ جہاد میں اترتی ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے کسی مدد کی توقع نہیں کرنی چاہیے۔ ’صابرون‘ اور ’صابرۃ‘ کی صفات سے ان آیتوں میں یہی بات واضح کی گئی ہے۔ ’واللّٰہ مع الصابرین‘ کے الفاظ بھی آیات کے آخر میں اسی حقیقت پر دلالت کرتے ہیں۔

دوم یہ کہ جنگ میں اترنے کے لیے مادی قوت کا حصول ناگزیر ہے۔ اس میں تو شبہ نہیں کہ جو کچھ ہوتا ہے، اللہ کے حکم سے ہوتا ہے اور آدمی کا اصل بھروسا اللہ پروردگارِ عالم ہی پر ہونا چاہیے، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا عالمِ اسباب کے طور پر بنائی ہے۔ دنیا کی یہ اسکیم تقاضا کرتی ہے کہ نیکی اور خیر کے لیے بھی کوئی اقدام اگر پیشِ نظر ہے تو

اس کے لیے ضروری وسائل ہر حال میں فراہم کیے جائیں۔ یہ اسباب و وسائل کیا ہونے چاہییں؟ دشمن کی قوت سے ان کی ایک نسبت اللہ تعالیٰ نے انفال کی ان آیتوں میں قائم کر دی ہے۔ یہ اگر حاصل نہ ہو تو مسلمانوں کو اس کے حصول کی کوشش کرنی چاہیے۔ جہاد کے شوق میں یا جذبات سے مغلوب ہو کر اس سے پہلے اگر وہ کوئی اقدام کرتے ہیں تو اس کی ذمہ داری انھی پر ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس صورت میں ان کے لیے کسی مدد کا ہرگز کوئی وعدہ نہیں ہے۔

سوم یہ کہ مادی قوت کی کمی کو جو چیز پورا کرتی ہے، وہ ایمان کی قوت ہے۔ 'علم ان فیکم ضعفاً' اور 'بانھم قوم لا یفقھون' میں یہی بات بیان ہوئی ہے۔ 'ضعف' کا لفظ عربی زبان میں صرف جسمانی اور مادی کمزوری کے لیے نہیں آتا، بلکہ ایمان و حوصلہ اور بصیرت و معرفت کی کمزوری کے لیے بھی آتا ہے۔ اسی طرح 'لا یفقھون' کے معنی بھی یہاں اس کے مقابلے میں ایمانی بصیرت سے محرومی ہی کے ہیں۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ منکرینِ حق چونکہ اس بصیرت سے محروم ہیں اور اللہ تعالیٰ نے تمھیں اس نعمت سے خوب خوب نوازا ہے، اس لیے تم اگر ہزار کے مقابلے میں سو بھی ہو گے تو اللہ کی نصرت سے تمھیں ان پر غلبہ حاصل ہو جائے گا۔

سورہ کے نظم سے واضح ہے کہ یہ نسبت معرکۂ بدر کے زمانے کی ہے۔ اس کے بعد بہت سے نئے لوگ اسلام میں داخل ہوئے جو عزم و بصیرت کے لحاظ سے 'سابقون الاولون' کے ہم پایہ نہیں تھے۔ اس کے نتیجے میں مسلمانوں کی تعداد اگرچہ بہت بڑھ گئی، لیکن ایمان کی قوت اس درجے پر نہیں رہی جو 'سابقون الاولون' کو حاصل تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بتادیا کہ اب یہ نسبت ایک اور دو کی ہے، مسلمانوں کے اگر سو ثابت قدم ہوں گے تو دو سو پر اور ہزار ثابت قدم ہوں گے تو اللہ کے حکم سے دو ہزار پر غلبہ پالیں گے۔

نصرتِ الٰہی کا یہ ضابطہ قدسیوں کی اس جماعت کے لیے بیان ہوا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں اور براہ راست اللہ کے حکم سے میدانِ جہاد میں اتری۔ بعد کے زمانوں میں، اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کی ایمانی حالت کے پیش نظر یہ نسبت کس حد تک کم یا زیادہ ہو سکتی ہے۔

اسیران جنگ

فَاِذَا لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ، حَتّٰٓی اِذَآ اَثْخَنْتُمُوْھُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ، فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً، حَتّٰی تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَھَا. (محمد ۴۷:۴)

''پھر جب اِن منکرین حق سے تمھاری مڈ بھیڑ ہو تو پہلا کام گردنیں مارنا ہے، یہاں تک کہ جب ان کا خون اچھی طرح بہا دو تو انھیں مضبوط باندھ لو۔ اس کے بعد یا تو احسان کر کے چھوڑ نا ہے یا فدیہ لے کر رہا کر دینا ہے، اُس وقت تک کہ جنگ

اپنے ہتھیار ڈال دے۔‘‘

آیت کے الفاظ سے واضح ہے کہ یہ اس زمانے میں نازل ہوئی ہے، جب عملاً کوئی جنگ تو ابھی مسلمانوں کو پیش نہیں آئی تھی، مگر حالات بتا رہے تھے کہ یہ کسی وقت بھی پیش آ سکتی ہے۔ اس موقع پر مسلمانوں کو بتایا گیا کہ سرزمین عرب کے ان منکرین حق سے اگر مڈ بھیڑ ہوتی ہے تو پہلا کام گردنیں مارنا ہے۔ پیغمبر کی طرف سے اتمام حجت کے بعد اپنے کفر پر اصرار کے باعث یہ کسی رعایت کے مستحق نہیں رہے، لہٰذا مقابلے پر آئیں تو ان کا اچھی طرح قلع قمع کر دیا جائے۔ اس کے بعد فرمایا ہے کہ جو باقی رہ جائیں، انھیں قیدیوں کی حیثیت سے باندھ لو۔ اللہ کی مدد تمھارے ساتھ ہے، اس لیے وہ تمھارے سامنے کچھ بھی نہ کر سکیں گے۔ پھر تمھیں اختیار ہے کہ چاہو تو احسان کے طور پر انھیں رہا کر دو اور چاہو تو ان سے فدیہ لے کر چھوڑ دو۔ تمھارا یہی معاملہ اس وقت تک ان کے ساتھ رہنا چاہیے، جب تک ان میں جنگ کا حوصلہ بالکل ختم نہیں ہو جاتا۔[۴۱]

سورۂ محمد کا یہ حکم اگرچہ مشرکینِ عرب کے حوالے سے بیان ہوا ہے، لیکن اس میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو اسے انھی کے ساتھ خاص قرار دیتی ہو، لہٰذا دوسرے مقاتلین بھی تبعاً اس میں شامل سمجھے جائیں گے۔

اس کے الفاظ ہیں: ’فاما منا بعد و اما فداء‘۔ زبان کے اداشناس جانتے ہیں کہ ’فداء‘ کے معنی اگر اس میں فدیہ لے کر چھوڑ دینے کے ہیں تو ’اما‘ کے ساتھ اس کے مقابل میں ہونے کی وجہ سے ’منّا‘ کے معنی بھی احسان کے طور پر رہا کر دینے کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتے۔ ’منّا‘ یہاں فعل محذوف کا مصدر ہے اور قتل کے مقابل میں نہیں، بلکہ فدیے کے مقابل میں آیا ہے، اس لیے یہ بالکل قطعی ہے کہ اس کے معنی بلا معاوضہ رہا کر دینے ہی کے ہیں۔ اس سے واضح ہے کہ جنگ کے قیدیوں کو مسلمان چھوڑ بھی سکتے تھے، ان سے فدیہ بھی لے سکتے تھے اور جب تک وہ قید میں رہتے، قرآنِ مجید کی رو سے، ملک یمین کی بنا پر ان سے کوئی فائدہ بھی اٹھا سکتے تھے، مگر انھیں قتل کرنے یا لونڈی غلام بنا کر رکھنے کی گنجایش اس حکم کے بعد ان کے لیے باقی نہیں رہی۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

تین قسم کے قیدی، البتہ اس سے مستثنیٰ تھے:

ایک وہ معاندین جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فیصلہ یہی تھا کہ قانونِ اتمام حجت کی رو سے جہاں پائے جائیں، فوراً قتل کر دیے جائیں، جیسے بدر واحد کے قیدیوں میں سے عقبہ بن ابی معیط، نضر بن الحارث[۴۲] اور ابوعزہ۔[۴۳] اسی طرح مکہ کے وہ چند افراد جو اس کی فتح کے موقع پر عام معافی سے مستثنیٰ قرار دیے گئے۔[۴۴]

۴۱؎ یہ بات اس لیے کہی گئی ہے کہ جنگ ختم ہو جانے کے بعد جو معاملہ ان کے ساتھ کرنا پیشِ نظر تھا، اس میں اسلام اور تلوار کے سوا کسی تیسری صورت کی گنجایش نہ تھی۔

۴۲؎ السیرۃ النبویہ، ابن ہشام ۲/ ۲۱۵۔

۴۳؎ السیرۃ النبویہ، ابن ہشام ۳/ ۸۳۔

۴۴؎ السیرۃ النبویہ، ابن ہشام ۴/ ۴۱۔

دوسرے بنو قریظہ کے قیدی جن پر خود ان کے مقرر کردہ حکم نے انھی کا قانون نافذ کیا جس کے نتیجے میں ان کے مرد قتل کر دیے گئے، اور عورتوں اور بچوں کو غلام بنا کر فروخت کر دیا گیا۔[45]

تیسرے وہ قیدی جو پہلے سے لونڈی غلام تھے اور بعض موقعوں پر اسی حیثیت سے لوگوں میں تقسیم کیے گئے۔[46]

یہ تینوں اقسام تو صاف واضح ہے کہ سورۂ محمد کے اس حکم سے متعلق ہی نہیں تھیں جس کا ذکر اوپر ہوا ہے۔ لہٰذا ان سے قطعِ نظر کر کے اگر اس معاملے میں زمانۂ رسالت کے واقعات کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات پورے اطمینان کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ کے عام قیدیوں کے ساتھ کوئی معاملہ اس حکم سے ہٹ کر نہیں کیا، بلکہ جو کچھ کیا ہے، ٹھیک اس کی پیروی میں کیا ہے۔

تفصیلات یہ ہیں:

۱۔ قیدی جب تک حکومت کی قید میں رہے، ان کے ساتھ نہایت اچھا سلوک کیا گیا۔ بدر کے قیدیوں کے بارے میں معلوم ہے کہ انھیں صحابہ کے گھروں میں بانٹ دیا گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت فرمائی کہ 'استوصوا بالاساری خیراً'[47] (ان قیدیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا)۔ ان میں سے ایک قیدی ابوعزیز کا بیان ہے کہ مجھے جن انصاریوں کے گھر میں رکھا گیا، وہ صبح و شام مجھے روٹی کھلاتے اور خود صرف کھجوریں کھا کر رہ جاتے تھے۔[48] یمامہ کے سردار ثمامہ بن اثال گرفتار ہوئے تو جب تک قید میں رہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے عمدہ کھانا اور دودھ ان کے لیے مہیا کیا جاتا رہا۔[49]

۲۔ بدر کے زیادہ تر قیدی فدیہ لے کر چھوڑے گئے۔ ان میں سے جو لوگ مالی معاوضہ دے سکتے تھے، ان سے فی قیدی ایک ہزار سے چار ہزار تک کی رقمیں لی گئیں اور جو مالی معاوضہ دینے کے قابل نہ تھے، ان کی رہائی کے لیے یہ شرط عائد کر دی گئی کہ وہ انصار کے دس دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں۔ ابوسفیان کا بیٹا عمرو، سعد بن نعمان کے بدلے میں جنھیں ابوسفیان نے قید کر لیا تھا، رہا ہوا۔[50] غزوۂ بنی المصطلق کے قیدیوں میں سے سیدہ جویریہ کو بھی ان کے والد حارث بن ابی ضرار نے فدیہ دے کر آزاد کرایا۔[51] سیدنا ابوبکر صدیق ایک مہم پر بھیجے گئے۔ وہاں انھوں نے قیدی پکڑے تو ان میں ایک نہایت خوب صورت عورت

۴۵؎ السیرۃ النبویہ، ابن ہشام ۳/ ۱۸۸۔۱۸۹۔

۴۶؎ السیرۃ النبویہ، ابن ہشام ۴/ ۱۰۵۔

۴۷؎ السیرۃ النبویہ، ابن ہشام ۲/ ۲۱۷۔

۴۸؎ السیرۃ النبویہ، ابن ہشام ۲/ ۲۱۷۔

۴۹؎ السیرۃ النبویہ، ابن ہشام ۴/ ۲۱۵۔

۵۰؎ الطبقات الکبریٰ، ابن سعد ۲/ ۲۲۔ السیرۃ النبویہ، ابن ہشام ۲/ ۲۲۱۔

۵۱؎ السیرۃ النبویہ، ابن ہشام ۳/ ۲۳۲۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

بھی تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے مکہ بھیج کر اس کے بدلے میں کئی مسلمان قیدی رہا کرا لیے۔[52] بنی عقیل کے ایک قیدی کو طائف بھیج کر قبیلۂ ثقیف سے مسلمانوں کے دو آدمی بھی اسی طرح رہا کرائے گئے۔[53]

۳۔ بعض قیدی بغیر کسی معاوضے کے رہا کیے گئے۔ بدر کے قیدیوں میں سے ابوالعاص، مطلب بن حنطب، صیفی بن ابی رفاعہ اور ابوعزہ، اور بنوقریظہ کے قیدیوں میں سے زبیر بن باطا اسی طرح رہا ہوئے۔[54] صلحِ حدیبیہ کے موقع پر مکہ کے ۸۰ آدمیوں نے تنعیم کی طرف سے آ کر شب خون مارا۔ یہ سب پکڑ لیے گئے اور حضور نے انھیں اسی طرح آزادی عطا فرمائی۔[55] ثمامہ بن اثال، جن کا ذکر اوپر ہوا ہے، وہ بھی اسی طرح رہا کیے گئے۔[56]

۴۔ بعض موقعوں پر قیدی لوگوں میں تقسیم کر دیے گئے کہ 'فاما منّا بعد و اما فداء' کے اصول پر وہ ان سے یا ان کے متعلقین سے خود معاملہ کر لیں۔ چنانچہ غزوہ بنی المصطلق کے قیدی اسی طرح لوگوں کو دیے گئے، لیکن سیدہ جویریہ کے آزاد ہو جانے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے نکاح کر لیا تو تمام مسلمانوں نے اپنے اپنے حصے کے قیدی یہ کہہ کر بغیر کسی معاوضے کے چھوڑ دیے کہ اب یہ حضور کے رشتہ دار ہو چکے ہیں۔ اس طرح سو خاندانوں کے آدمی رہا ہوئے۔[57] سریۂ ہوازن کے قیدی بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے لے کر اسی طرح رہا کرا دیے۔[58] غزوۂ حنین کے موقع پر بھی یہی ہوا۔ قبیلۂ ہوازن کا وفد اپنے قیدیوں کی رہائی کے لیے آیا تو قیدی تقسیم ہو چکے تھے۔ انھوں نے درخواست کی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سب مسلمانوں کو جمع کیا اور فرمایا: یہ لوگ تائب ہو کر آئے ہیں۔ میری رائے ہے کہ ان کے قیدی چھوڑ دیے جائیں۔ تم میں سے جو بلا معاوضہ چھوڑنا چاہے، وہ اس طرح چھوڑ دے اور جو معاوضہ لینا چاہے، اسے حکومت کی طرف سے معاوضہ دیا جائے گا۔ اس کے نتیجے میں چھ ہزار قیدی رہا کر دیے گئے اور جن لوگوں نے معاوضے کا مطالبہ کیا، انھیں حکومت کی طرف سے معاوضہ دے دیا گیا۔[59]

۵۔ جو عورتیں اسی اصول پر لوگوں کو دی گئیں اور ان کے ماں باپ، شوہر وغیرہ جنگوں میں مارے گئے تھے، ان سے لوگوں

---

۵۲ ابن ماجہ، رقم ۲۸۴۶۔

۵۳ احمد بن حنبل، رقم ۱۹۳۲۶۔

۵۴ السیرۃ النبویہ، ابن ہشام ۲/ ۲۲۸، ۳/ ۱۹۰۔

۵۵ ابوداؤد، رقم ۲۶۸۸۔

۵۶ السیرۃ النبویہ، ابن ہشام ۴/ ۲۱۵۔ ۲۱۶۔

۵۷ السیرۃ النبویہ، ابن ہشام ۳/ ۲۳۱۔

۵۸ السیرۃ النبویہ، ابن کثیر ۳/ ۴۵۳۔

۵۹ السیرۃ النبویہ، ابن ہشام ۴/ ۱۰۴۔ ۱۰۶۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

نے بالعموم انھیں آزاد کر کے نکاح کر لیا۔ خیبر کے قیدیوں میں سے سیدہ صفیہ اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آئیں۔[60]

اموال غنیمت

یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ، قُلِ : الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ ، فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ، اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ . (الانفال ۸:۱)

''وہ تم سے غنائم کے بارے میں پوچھتے ہیں، انھیں بتادو کہ غنائم تو سب اللہ اور رسول کے لیے ہیں۔ لہٰذا اگر تم سچے مومن ہو تو اللہ سے ڈرتے رہو، باہمی تعلقات کی اصلاح کرو، اور اللہ اور اس کے رسول کے فرماں بردار بن کر رہو۔''

یہ آیت جس سورہ میں آئی ہے، اس کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین عرب کے ساتھ پہلی جنگ کے بعد ہی یہ نزاع مسلمانوں میں پیدا ہوگئی کہ اس میں جو مال غنیمت ہاتھ آیا ہے، اس کی تقسیم کس طرح ہونی چاہیے۔ قرآن نے یہ اسی نزاع پر انھیں تنبیہ کی اور اس کے متعلق اپنا فیصلہ سنایا ہے کہ ان جنگوں کے مال غنیمت پر کسی شخص کا بھی کوئی حق قائم نہیں ہوتا۔ یہ سب اللہ اور رسول کا ہے اور وہ اس کے ساتھ جو معاملہ چاہیں گے، اپنی صواب دید کے مطابق کریں گے۔ اس کی وجہ وہی ہے جو ہم پیچھے تفصیل کے ساتھ بیان کر چکے ہیں کہ زمانۂ رسالت کی یہ جنگیں زیادہ تر اللہ تعالیٰ کے قانونِ اتمامِ حجت کے تحت لڑی گئی تھیں اور ان میں لڑنے والوں کی حیثیت اصلاً آلات و جوارح ہی کی تھی۔ وہ اللہ کے حکم پر میدان میں اترے اور براہِ راست اس کے فرشتوں کی مدد سے فتح یاب ہوئے۔ لہٰذا ان جنگوں کے مالِ غنیمت پر ان کا کوئی حق تو اللہ تعالیٰ نے تسلیم نہیں کیا، تاہم اسی سورہ میں آگے جا کر بتا دیا کہ اس کے باوجود یہ سارا مال نہیں، بلکہ اس کا پانچواں حصہ ہی اجتماعی مقاصد کے لیے خاص رہے گا اور باقی مجاہدین میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ ارشاد فرمایا ہے:

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَ لِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ . (الانفال ۸:۴۱)

''اور جان لو کہ جو غنیمتیں بھی تم نے پائی ہیں، ان میں پانچواں حصہ اللہ، اس کے پیغمبر، پیغمبر کے اقربا اور یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے خاص رہے گا۔''

یہ تقسیم بھی صاف واضح ہے کہ صرف اس وجہ سے کی گئی کہ لوگوں نے جنگ بہرحال لڑی تھی۔ اس کے لیے زادِ راہ کا بندوبست بھی کیا تھا اور اس کی ضرورتوں کے لیے اسلحہ، گھوڑے اور اونٹ وغیرہ بھی خود ہی مہیا کیے تھے۔ چنانچہ جب اس طرح کے اموال مسلمانوں کو حاصل ہوئے جن کے لیے انھیں یہ اہتمام نہیں کرنا پڑا تو قرآن نے واضح کر دیا کہ یہ سب دین وملت

۶۰؎ بخاری، رقم ۴۲۰۰۔

کی اجتماعی ضرورتوں اور قوم کے غربا و مساکین کے لیے خاص کر دیا گیا ہے، اس کا کوئی حصہ بھی مجاہدین میں تقسیم نہیں ہوگا:

وَمَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰی رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّلَا رِكَابٍ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰی مَنْ يَّشَآءُ، وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ. مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰی رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰی فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْيَتٰمٰی وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ. (الحشر ۵۹: ۶-۷)

''اور اللہ نے جو کچھ ان لوگوں سے لے کر اپنے رسول کی طرف لوٹایا ہے تو اِس پر تم نے اپنے اونٹ اور گھوڑے نہیں دوڑائے، بلکہ اللہ ہے جو اپنے رسولوں کو جس پر چاہتا ہے مسلط کر دیتا ہے اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ اللہ نے جو کچھ اِن بستیوں کے لوگوں سے لے کر اپنے رسول کی طرف لوٹایا ہے، وہ اللہ، اس کے پیغمبر، پیغمبر کے اقربا اور یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے خاص رہے گا۔''

یہاں اور اس سے اوپر سورۂ انفال کی آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان اجتماعی مقاصد کی تفصیل کر دی ہے جن کے لیے یہ اموال خاص کیے گئے تھے۔

سب سے پہلے اللہ کا حق بیان ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ، ظاہر ہے کہ ہر چیز سے غنی اور بے نیاز ہے۔ اس کے نام کا حصہ اس کے دین ہی کی طرف لوٹتا ہے۔ لہٰذا اس کا اصلی مصرف وہ کام ہوں گے جو دین کی نصرت اور حفاظت و مدافعت کے لیے مسلمانوں کا نظم اجتماعی اپنی دینی ذمہ داری کی حیثیت سے انجام دیتا ہے۔

دوسرا حق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بتایا گیا ہے۔ آپ کی شخصیت میں اس وقت نبوت و رسالت کے ساتھ مسلمانوں کی حکومت کے سربراہ کی ذمہ داری بھی جمع ہو گئی تھی اور آپ کے اوقات کا لمحہ لمحہ اپنے یہ منصبی فرائض انجام دینے میں صرف ہو رہا تھا۔ اس ذمہ داری کے ساتھ اپنی معاش کے لیے کوئی کام کرنا آپ کے لیے ممکن نہ تھا۔ اس صورتِ حال میں ضروری ہوا کہ اس مال میں آپ کا حق بھی رکھا جائے۔ اس کی نوعیت کسی ذاتی ملکیت کی نہیں تھی کہ اسے آپ کے وارثوں میں تقسیم کیا جاتا۔ لہٰذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد یہ آپ سے آپ ان کاموں کی طرف منتقل ہو گیا جو آپ کی نیابت میں مسلمانوں کے نظم اجتماعی کے لیے انجام دینا ضروری تھے۔

تیسرا حق 'ذی القربیٰ' کا بیان کیا گیا ہے۔ اس سے، ظاہر ہے کہ آپ کے وہ قربت دار مراد ہیں جن کی کفالت آپ کے ذمہ تھی اور جن کی ضرورتیں پوری کرنا اخلاقی لحاظ سے آپ اپنا فرض سمجھتے تھے۔ آپ کی حیثیت تمام مسلمانوں کے باپ کی تھی۔ چنانچہ آپ کے بعد یہ ذمہ داری عرفاً و شرعاً مسلمانوں کے نظم اجتماعی کو منتقل ہوئی اور ذی القربیٰ کا یہ حق بھی جب تک وہ دنیا میں رہے، اسی طرح قائم رہا۔

چوتھا حق یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کا ہے۔ ان کا حق بیان کرتے ہوئے اس 'ل' کا اعادہ نہیں فرمایا جو اوپر اللہ، رسول اور ذی القربیٰ، تینوں کے ساتھ آیا ہے، بلکہ ان کا ذکر ذی القربیٰ کے ذیل ہی میں کر دیا ہے۔ اس سے مقصود اس طبقہ کی عزت

افزائی ہے کہ گویا یہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقربا ہی کے تحت ہیں۔ یہ حق کسی وضاحت کا محتاج نہیں ہے۔ ہر وہ معاشرہ جو ان طبقات کی ضرورتوں کے لیے حساس نہیں ہے، جس میں یتیم دھکے کھاتے، مسکین بھوکے سوتے اور مسافر اپنے لیے کوئی پرسانِ حال نہیں پاتے، اسے اسلامی معاشرے کا پاکیزہ نام نہیں دیا جا سکتا۔

اموالِ غنیمت سے متعلق اس بحث سے واضح ہے کہ یہ اصلاً اجتماعی مقاصد کے لیے خاص ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجاہدین کا کوئی ابدی حق ان میں قائم نہیں کیا گیا کہ مسلمانوں کی حکومت اسے ہر حال میں ادا کرنے کی پابند ہو۔ وہ اپنی تمدنی ضرورتوں اور اپنے حالات کے لحاظ سے جو طریقہ چاہے، اس معاملے میں اختیار کر سکتی ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ریحان احمد یوسفی

عروج و زوال کا قانون ـــــ تاریخ کی روشنی میں

(۴)

قرآن اور عروج و زوال کا قانون

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

عروج وزوال کا قانون اصلاً تاریخ کا موضوع ہے۔ تاہم قرآن بھی تاریخ کو اپنے مخاطبین کے سامنے استدلال کے طور پر پیش کرتا ہے۔ اس میں نہ صرف اقوام سابقہ کے حالات بالتفصیل بیان کیے گئے ہیں، بلکہ اس ضمن میں بعض اصولی باتیں بھی بیان کی گئی ہیں۔ اس لیے یہ ممکن نہیں رہتا کہ قرآن کو نظر انداز کر کے عروج وزوال کے قانون کو صرف تاریخ کی روشنی میں بیان کیا جائے۔

اس بات کو ایک دوسرے انداز سے دیکھیے۔ قرآن خدا کا تعارف ایک علت العلل اور مبدا اول کے طور پر نہیں کراتا۔ یعنی ایک ایسا وجود جس نے کائنات کو تخلیق کیا اور اس کے بعد وہ کہیں جا کر سو گیا۔ قرآن کا خدا ایک زندہ اور فعال ہستی ہے جس کے علم میں آئے بغیر ایک پتا بھی زمین پر نہیں گرتا۔ ایسے خدا سے یہ کیسے متوقع ہے کہ پوری پوری قوموں کے معاملات سے وہ لاتعلق رہے۔ البتہ دو باتیں اس ضمن میں ملحوظ رہنی چاہییں۔ اول یہ کہ خدا جو کچھ کرتا ہے، اس کا تعلق انسانوں کے اختیار سے نہیں، بلکہ اس کی وسیع تر حکمت سے ہوتا ہے جس کے تحت اسے کائنات کا نظم چلانا ہے۔ تاریخ میں خدا کی مداخلت سے انسانی اختیار پر پہرے نہیں بیٹھتے۔ اس ضمن میں اصولی بات یہ ہے کہ فرد کی تقدیر کا فیصلہ اس کا ذاتی عمل اور قوم کی تقدیر کا فیصلہ قوم کا اجتماعی عمل کرتا ہے۔ خدا کا کام فیصلہ سنانا اور سزا و جزا دینا ہے۔ یہ فیصلہ فرد کے لیے آخرت میں اور قوم کے لیے دنیا میں سنایا جاتا ہے۔ دوم یہ کہ خدا غیب سے باہر آ کر انسانوں سے معاملہ نہیں کرتا۔ وہ جو کرتا ہے، اسباب کے دائرے اور اصولوں کی حد بندی میں کرتا ہے۔ چنانچہ پچھلے باب میں ہم نے دیکھا کہ تاریخ کے آئینے میں خدا باطن ہے اور ایسا باطن کہ اسباب کے

پردے کبھی بھی اسے مخلوق کے سامنے نہیں آنے دیتے۔ جبکہ قرآن کی روشنی میں خدا ظاہر ہے اور ایسا ظاہر کہ تاریخ کے ہر صفحے پر اس کے آثار نقش ہیں۔ اس باب میں ہم انھی آثار و نقوش کا مطالعہ کرنے جا رہے ہیں۔

قرآن اصلاً تاریخ کی نہیں، ہدایت کی کتاب ہے۔ اس لیے اقوام عالم کے عروج و زوال سے متعلق اگر اس میں کچھ کہا گیا ہے تو وہ محض ضمنی طور پر ہے۔ قرآن میں اصلاً ان قوموں کے عروج و زوال کے ضابطے بیان کیے گئے ہیں جن تک اللہ تعالیٰ کی ہدایت براہِ راست پہنچی ہے۔ یہ اقوام دو قسم کی ہیں۔ ایک رسولوں کی مخاطب اقوام اور دوسری امتِ مسلمہ۔ اول الذکر کے معاملے میں ان قوانین کی کوئی حیثیت نہیں رہتی جن کا ذکر ہم پچھلے باب میں کر چکے ہیں۔ بلکہ ان اقوام کے ساتھ معاملہ کرنے کے قوانین کچھ دوسرے ہیں جن کا ذکر ذیل میں آ رہا ہے۔ تاہم ختم نبوت و رسالت کے ساتھ رسولوں کی اقوام کے بارے میں دیا گیا قانون اور اس کے تمام اطلاقات اب ختم ہو چکے ہیں۔ جہاں تک امت مسلمہ سے متعلق قانون کا تعلق ہے تو اس کے معاملے میں عروج و زوال کے تمام دیگر ضابطے اپنی جگہ موجود رہتے ہیں۔ البتہ ان میں کچھ نئے پہلوؤں کا اضافہ ہو جاتا ہے، لیکن ان کا تعلق صرف اس عامل سے ہے جسے ہم اخلاقی اقدار کے تحت پچھلے باب میں بیان کر چکے ہیں۔ یعنی امت مسلمہ کی اخلاقی اقدار کی بنیاد صرف فطرت نہیں رہتی، بلکہ خدا کی براہِ راست رہنمائی حاصل ہونے کے بعد یہی رہنمائی ان کی اخلاقی اقدار کی بنیاد بن جاتی ہے۔ اس کی تفصیلات آگے آ رہی ہیں، جبکہ عروج و زوال کے دیگر عوامل ان کے بارے میں اسی طرح موثر رہتے ہیں جس طرح وہ دیگر اقوام کے بارے میں روبہ عمل ہوتے ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

اس سے قبل کہ ہم اس گفتگو کا آغاز کریں اس بات کی وضاحت ضروری ہے اس باب میں ہمارے نقطۂ نظر کی اساس قرآن پر غور و فکر کی اس روایت پر مبنی ہے جس کی طرح پچھلی صدی کے ایک جلیل القدر عالم حمید الدین فراہی نے ڈالی تھی۔ پہلی تحقیق ان کے شاگرد امین احسن اصلاحی اور دوسری تحقیق اصلاحی کے شاگرد جاوید احمد غامدی کے قرآن پر غور و فکر کا نتیجہ ہے۔ مصنف نے قوموں کے عروج و زوال پر اس کا اطلاق کر کے ایک منطقی ربط کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس پیشکش میں اگر کوئی ضعف ہے تو اس کی ذمہ داری مصنف پر عائد ہوتی ہے۔

رسولوں کی مخاطب اقوام کے بارے میں عروج و زوال کا قانون

اللہ تعالیٰ نے ہر دور میں انسانوں کو اپنی ہدایت سے نوازا ہے۔ جس کے ذریعے سے انسانیت کو اس بنیادی حقیقت کی یاد دہانی کرائی گئی ہے کہ انسان اس دنیا میں ایک محدود مدت کے لیے آزمایش کی غرض سے بھیجے گئے ہیں۔ اس دنیا کے بعد ایک اور دنیا ہے جس میں انھیں ہمیشہ قیام کرنا ہے۔ روزِ قیامت اس دنیا کا نقطۂ آغاز ہے۔ قیامت کے دن سب لوگ اللہ کے حضور پیش کیے جائیں گے اور ان کے اعمال کی بنیاد پر ان کے ابدی مستقبل کا فیصلہ ہوگا۔ نیکوکار لوگ جنت میں جائیں گے اور

بدکار جہنم کا ایندھن بنیں گے۔قرآن میں اس بات کو یوں بیان کیا گیا ہے:

''بڑی ہی عظیم اور بافیض ہے وہ ذات جس کے قبضۂ قدرت میں (اس کائنات کی) بادشاہی ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ جس نے پیدا کیا موت اور زندگی کو تاکہ تمھارا امتحان کرے کہ تم میں سے کون سب سے اچھے عمل والا بنتا ہے۔اور وہ غالب بھی ہے (کہ سزا دے) اور مغفرت فرمانے والا بھی (کہ جنت میں داخل کردے)۔'' (الملک ۶۷: ۱۔۲)

''ہم نے کہا: اترو یہاں سے سب! تو اگر آئے تمھارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت تو جو میری ہدایت کی پیروی کریں گے ان کے لیے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے اور جو کفر کریں گے اور جھٹلائیں گے میری آیتوں کو، وہی لوگ دوزخ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔'' (البقرہ ۲: ۳۸۔۳۹)

اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں کئی طریقوں سے انسانوں کی ہدایت و رہنمائی کا بندوبست کیا ہے۔فطرت ہر انسان کی رہنما ہے۔عقل وخرد سے ہر انسان نوازا گیا ہے۔انفس و آفاق کی نشانیاں قدم قدم پر انسان کی رہنمائی کے لیے موجود ہیں۔تاہم اس ہدایت کا سب سے بڑا نشان انبیا علیہم السلام تھے جو انسانوں کی زبان میں براہِ راست انسانوں کی رہنمائی کرتے تھے۔ پہلے انسان حضرت آدم علیہ السلام ایک نبی تھے۔جس کے بعد ہر دور اور قوم میں نبی آتے رہے (الرعد ۱۳: ۷)۔ان انبیا کی بعثت کا مقصد قرآن میں یوں بیان کیا گیا ہے:

''لوگ ایک ہی امت بنائے گئے۔(انھوں نے اختلاف پیدا کیا) تو اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء بھیجے جو خوش خبری سناتے اور خبردار کرتے آئے۔اور ان کے ساتھ کتاب بھیجی قولِ فیصل کے ساتھ تاکہ جن باتوں میں لوگ اختلاف کر رہے ہیں، ان کا فیصلہ کردے۔'' (البقرہ ۲: ۲۱۳)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

قرآن کی ان آیات کے مطابق اللہ کے نبی جب اپنی قوم کی طرف بھیجے جاتے ہیں تو لوگوں کے لیے منذر اور مبشر بن کر آتے ہیں۔یعنی وہ نیکوکاروں کو جنت کی خوش خبری سناتے اور بدکاروں کو جہنم کے انجام سے ڈراتے ہیں۔نیز وہ لوگوں کو ان کے اختلافات میں درست راستہ دکھاتے ہیں۔حق کی طرف اس واضح اور قطعی رہنمائی اور مذہبی اختلافات میں فیصلہ کن رہبری کے بعد لوگوں کے پاس کوئی عذر نہیں رہ جاتا جسے وہ روز قیامت اپنے رب کے حضور پیش کرسکیں۔نبیوں کی اسی رہنمائی، انذار اور تبشیر کو سورۂ نساء (۴) کی آیت ۱۶۵ میں اتمام حجت کہا گیا ہے۔

ان نبیوں ہی میں سے بعض ایسے ہوتے ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ رسالت کے منصب پر فائز کردیتے ہیں۔ہمارے نزدیک نبی اور رسول میں بنیادی فرق یہ ہے کہ نبی کے اتمام حجت کے بعد اس کا نتیجہ دنیا میں نکلنا ضروری نہیں ہوتا، لیکن ایک رسول کے اتمام حجت کے بعد دنیا ہی میں اس کی مخاطب قوم کی مہلت عمر کا فیصلہ ہوجاتا ہے۔اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ نبی لوگوں کو صرف حق پہنچانے تک محدود رہتا ہے۔وہ آسمان سے وحی کی ہدایت پاتا ہے اور اہل زمین کو اس حق پر مطلع کرتا ہے۔اس کا یہ ابلاغ حق اس قدر واضح ہوتا ہے کہ لوگ قیامت کے دن اللہ کی بارگاہ میں یہ عذر پیش نہیں کرسکتے کہ صحیح بات ان پر واضح نہ تھی۔تاہم ان کی تکذیب و نافرمانی کے نتیجے میں ان کی مخاطب قوم پر کوئی عذاب نہیں ٹوٹتا۔حتیٰ کہ ان کی قوم اگر انھیں قتل

کر ڈالے تب بھی خدا فوری طور پر اس قوم کو سزا نہیں دیتا۔

تاہم رسول کا معاملہ اس سے ایک قدم آگے ہوتا ہے۔ قرآن سے ہمارے سامنے جو تصویر آتی ہے، اس کے مطابق کسی قوم کی طرف ایک رسول کی بعثت کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی وہ عدالت جو دوسروں کے لیے قیامت کے دن لگنی ہے، اس رسول کی مخاطب قوم کے لیے دنیا میں لگ چکی ہے۔ رسول، ایک نبی کی طرح نہ صرف اپنی قوم کو اخروی زندگی میں کامیابی اور ناکامی کے بارے میں بتاتے ہیں، بلکہ اس دنیا میں اپنے پیروکاروں کو کامیابی کی بشارت دیتے اور کفر و نافرمانی پر دنیا میں ہی اللہ کے عذاب سے ڈراتے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنے رب کا پیغام باصراحت لوگوں تک پہنچاتے ہیں اور جب ان کی قوم ان کی بات نہیں مانتی تو لازماً اس دنیا میں ہی خدا کے عذاب کا کوڑا اس قوم پر برس جاتا ہے اور وہ قوم ہلاک کر دی جاتی ہے۔ اور اگر رسولوں کی بات مان لی جائے تو پھر دنیا میں ہی ان پر خدا کی رحمتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ گویا کہ دنیا میں قوم کا عروج و زوال اب صرف اس رسول سے وابستہ ہو جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ ایک رسول جب اپنی قوم کو حق سے آگاہ کرتا ہے تو اس کا کیا ہوا اتمام حجت اس درجہ کا قطعی ہوتا ہے کہ اس کے بعد قیامت کے انتظار کی ضرورت باقی نہیں رہتی اور اللہ تعالیٰ رسول کی مخاطب قوم کو دنیا میں ہی ان کے کفر کی پاداش میں فنا کر دیتا ہے۔

نبی اور رسول کا یہ فرق اس وقت تک واضح نہیں ہوگا، جب تک اس بات کو نہ سمجھ لیا جائے کہ لفظ نبی کے برخلاف جو قرآن میں صرف اپنے اصطلاحی معنوں میں استعمال ہوا ہے، رسول کا لفظ، اپنے مذکورہ بالا اصطلاحی معنوں کے علاوہ، بکثرت اپنے لغوی معنوں یعنی بھیجے ہوئے اور پیغام پہنچانے والے کے مفہوم میں بھی استعمال ہوا ہے۔ قرآن نے اس لفظ کو پیغام پہنچانے والے کے مفہوم میں ایک عام آدمی کے لیے بھی استعمال کیا ہے (یوسف ۱۲: ۵۰)۔ اسی طرح یہ لفظ اپنے لغوی معنوں میں فرشتوں کے لیے بھی قرآن میں بکثرت استعمال ہوا ہے۔ مثلاً حضرت جبریل علیہ السلام کے لیے التکویر ۸۱: ۱۹، الحاقہ ۶۹: ۴۰ اور مریم ۱۹: ۱۹ میں اور دیگر فرشتوں کے لیے الانعام ۶: ۶۱، یونس ۱۰: ۲۱، ھود ۱۱: ۶۹، فاطر ۳۵: ۱ اور دیگر کئی مقامات پر استعمال ہوا ہے۔

ٹھیک اسی طرح یہ لفظ اپنے لغوی مفہوم میں ان نبیوں کے لیے بھی قرآن نے استعمال کیا ہے جو اصطلاحی معنوں میں رسول نہیں ہوتے، کیونکہ بہر حال تمام انبیا علیہم السلام خدا کے بھیجے ہوئے اور اسی کا پیغام پہنچانے والے ہوتے ہیں۔ مثلاً سورۂ بقرہ میں ارشاد ہوا:

> ''اور ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور اس کے بعد پے در پے رسول بھیجے اور عیسیٰ ابن مریم کو کھلی کھلی نشانیاں دیں اور روح القدس سے اس کی تائید کی۔ تو کیا جب جب آئے گا کوئی رسول تمھارے پاس وہ باتیں لے کر جو تمھاری خواہشوں کے خلاف ہوں گی تو تم تکبر کرو گے؟ سو ایک گروہ کو جھٹلایا اور ایک گروہ کو قتل کرتے رہے۔'' (۲: ۸۷)

یہ معلوم بات ہے کہ بنی اسرائیل میں پے در پے رسول نہیں نبی آئے تھے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن دیگر مقامات پر

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

یہ بات واضح کر دیتا ہے کہ بنی اسرائیل کے ہاتھوں جن لوگوں کا قتل ہوا، وہ نبی ہی تھے (آل عمران ۳:۱۱۲، النساء۴: ۱۵۵)۔ نیز اس آیت میں بیان کیا گیا ہے کہ بنی اسرائیل انبیا کو قتل کرتے رہے جو قرآن کے اس صریح بیان کے خلاف ہے جس کے مطابق اللہ اور اس کے رسولوں کے لیے غلبہ لازمی ہے۔ ارشاد ہوا:

''اللہ نے لکھ رکھا ہے کہ بے شک میں غالب رہوں گا اور میرے رسول بھی۔ بے شک اللہ بڑا ہی زورآور اور غالب ہے''۔ (المجادلہ ۵۸:۲۱)

اس لیے یہ بات بالکل واضح ہے کہ یہاں رسول کا لفظ اپنے لفظی مفہوم میں انبیا کے لیے استعمال ہوا ہے۔ قرآن دیگر مقامات پر بھی رسول کا لفظ نبی کے لیے استعمال کرتا ہے۔ تاہم سیاق وسباق اس بات کا تعین کر دیتے ہیں کہ یہاں یہ لفظ کن معنوں میں ہے۔

لفظ رسول کے متعلق یہ جاننے کے بعد کہ وہ اپنے اصطلاحی معنوں کے علاوہ لغوی معنوں میں عام افراد، انبیا اور فرشتوں کے لیے بھی استعمال ہوا ہے، ہم یہ دیکھتے ہیں رسول کس طرح انبیا سے مختلف ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ رسول نبی سے خاص ایک گروہ ہیں، یہ بات خود قرآن سے واضح ہے۔ سورۂ حج میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

''اور ہم نے تم سے پہلے جو رسول اور نبی بھی بھیجا تو جب بھی اس نے کوئی ارمان کیا شیطان نے اس کی راہ میں اڑنگے ڈالے۔'' (الحج ۲۲:۵۲)

زبان کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ دو مترادف کبھی ایک ساتھ اس طرح استعمال نہیں ہوتے۔ مثلاً اردو میں آدمی اور انسان ہم معنی ہیں۔ اب اگر یہ کہا جائے کہ اس دنیا میں جو آدمی اور انسان آتا ہے وہ آدم کی اولاد ہے تو یہ جملہ درست نہ ہوگا۔ یہ جملہ صرف اس وقت صحیح ہوگا جب یہ مانا جائے کہ قائل اس جملے میں آدمی اور انسان کو مترادف نہیں، بلکہ الگ الگ اصطلاح سمجھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ٹھیک یہی اسلوب یہاں اختیار کر کے یہ بتا دیا ہے کہ منصب رسالت اور منصب نبوت، دونوں یکساں نہیں ہیں۔

ابن حبان کی ایک روایت سے بھی یہ بات نکلتی ہے کہ نبی اور رسول بالکل یکساں نہیں ہیں۔ اس روایت کے مطابق نبیوں کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے جن میں سے تین سو تیرہ کو اللہ تعالیٰ نے رسول بنا کر بھیجا۔

جہاں تک اس بات کا سوال ہے کہ رسولوں کی مخاطب اقوام پر اتمام حجت کے بعد دنیا میں ہی عذاب آ جاتا ہے، قرآن میں یہ بات مختلف اسالیب میں بیان ہوئی ہے۔ اس ضمن میں چند قرآنی آیات درج ذیل ہیں:

''اور تیرا رب بستیوں کو ہلاک کرنے والا نہیں بنتا، جب تک ان کی مرکزی بستی میں کوئی رسول نہ بھیج لے، جو ان کو ہماری آیتیں پڑھ کر سنائے۔'' (القصص ۲۸:۵۹)

''اور کافروں نے اپنے رسولوں سے کہا کہ یا تو ہم تمھیں اپنی سرزمین سے نکال کر رہیں گے یا تمھیں ہماری ملت میں پھر واپس آنا پڑے گا۔ تو ان کے رب نے ان پر وحی بھیجی کہ ہم ان ظالموں ہی کو ہلاک کر دیں گے اور ان کے بعد تم کو زمین میں

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

بسائیں گے۔'' (ابراہیم ۱۴: ۱۳۔۱۴)

''اور ہم عذاب دینے والے نہیں تھے جب تک کسی رسول کو بھیج نہ دیں۔'' (بنی اسرائیل ۱۷: ۱۵)

''اور ہم نے تم سے پہلے بھی بہت سی امتوں کے پاس اپنے رسول بھیجے۔ پس ان کو مالی اور جسمانی تکالیف میں مبتلا کیا تا کہ وہ خدا کے آگے جھکیں تو کیوں جب ہماری پکڑ آئی وہ خدا کی طرف نہ جھکے، بلکہ ان کے دل سخت ہو گئے اور شیطان نے ان کی نگاہوں میں اسی عمل کو کھبا دیا جو وہ کرتے رہے تھے تو جب انھوں نے فراموش کر دیا اس چیز کو جس سے ان کو یاد دہانی کی گئی تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیے، یہاں تک کہ جب وہ اس چیز پر اترانے لگے جو انھیں دی گئی تو ہم نے ان کو دفعتہً پکڑ لیا، پس وہ بالکل ہک دک رہ گئے۔ پس ان لوگوں کی جڑ کاٹ دی گئی جنھوں نے ظلم کا ارتکاب کیا اور شکر کا سزاوار حقیقی صرف اللہ ہے، تمام عالم کا رب۔'' (الانعام ۶: ۴۲۔۴۵)

سورۂ اعراف میں حضرت نوح، حضرت ھود، حضرت صالح، حضرت لوط اور حضرت شعیب کی قوم کے تذکرے کے بعد اللہ تعالیٰ ایک جامع تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اور ہم نے جس بستی میں کسی نبی کو رسول بنا کر بھیجا، اس کے باشندوں کو مالی اور جسمانی مصائب سے آزمایا کہ وہ رجوع کریں پھر ہم نے دکھ کو سکھ سے بدل دیا۔ یہاں تک کہ وہ پھلے پھولے اور کہنے لگے کہ دکھ اور سکھ تو ہمارے باپ دادوں کو بھی پہنچے ہیں۔ پھر ہم نے ان کو اچانک پکڑ لیا اور وہ اس کا گمان نہیں رکھتے تھے۔ اور اگر بستیوں والے ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان و زمین کی برکتوں کے دروازے کھول دیتے، لیکن انھوں نے جھٹلایا تو ہم نے ان کی کرتوتوں کی پاداش میں انھیں پکڑ لیا۔'' (الاعراف ۷: ۹۴۔۹۶)

ان آیات میں نبی کا لفظ استعمال ہوا ہے، مگر اس کے ساتھ 'ارسلنا' کا فعل آیا ہے، جس کا ایک مفہوم رسول بنا کر بھیجنا ہے۔ اس کی مثال سورۂ نحل (۱۴) آیت ۴۴ میں دیکھی جا سکتی ہے جس میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''اور ہم نے تم سے پہلے بھی آدمیوں ہی کو رسول بنا کر بھیجا۔'' یہاں پر یہ اسی مفہوم میں آیا ہے۔ مزید براں قرآن کے دیگر مقامات اور آگے چل کر انھی آیات میں اللہ تعالیٰ نے وضاحت کی ہے کہ یہ انبیا منصب رسالت پر فائز تھے۔ فرمایا:

''یہ بستیاں ہیں جن کی سرگزشتوں کا کچھ حصہ ہم تمھیں سنا رہے ہیں۔ ان کے پاس ان کے رسول کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے تو وہ ایمان لانے والے نہ بنے۔'' (الاعراف ۷: ۱۰۱)

سورۂ توبہ میں چھ رسولوں کی اقوام کے حوالے سے فرمایا:

''کیا انھیں ان لوگوں کی سرگزشت نہیں پہنچی جو ان سے پہلے گزرے۔ قوم نوح، عاد، ثمود، قومِ ابراہیم، اصحاب مدین اور الٹی ہوئی بستیوں کی۔ ان کے پاس ان کے رسول کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے تو اللہ ان کے اوپر ظلم کرنے والا نہیں بنا، بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنے۔'' (التوبہ ۹: ۷۰)

سورۂ حج میں یہی بات سات اقوام کے حوالے سے بیان کی گئی:

''اور اگر یہ لوگ تمھاری تکذیب کر رہے ہیں (تو یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے)۔ ان سے پہلے قوم نوح، عاد، ثمود، قوم

ابراہیم، قوم لوط اور مدین کے لوگ بھی تکذیب کر چکے ہیں۔ اور موسیٰ کی بھی تکذیب کی گئی تو میں نے ان کافروں کو کچھ ڈھیل دی، پھر ان کو دھر لیا تو دیکھو کیسی ہوئی میری پھٹکار۔'' (الحج ۲۲: ۴۲-۴۴)

سورۂ قمر (۵۴) میں بالتفصیل یہی بات حضرت نوح، حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت لوط اور حضرت موسیٰ کی اقوام کے حوالے سے بیان کی گئی ہے۔ رسول اپنی قوم پر کس طرح اتمام حجت کرتے ہیں، اس کی داستان قرآن میں جگہ جگہ بیان کی گئی ہے۔ تاہم ایک رسول کی زندگی میں آنے والے تمام مراحل کی داستان کو اگر بہت اختصار سے پڑھنا ہے تو قران کی ایک بہت چھوٹی سورت یعنی سورۂ نوح (۷۱) پڑھ لیں جس میں اللہ تعالیٰ نے سیدنا نوح کی ہزار سالہ دعوت کے تمام مراحل اور اس کے نتائج کا نچوڑ بہت اختصار کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیرہ سال تک مکے کی زندگی میں ہر طرح کی مخالفت جھیل کر کفارِ مکہ پر اتمامِ حجت کیا۔ قرآن کا وہ حصہ جو مکہ میں نازل ہوا اور باعتبار حجم دو تہائی ہے، اسی اتمامِ حجت کی داستان ہے۔ جب کسی قوم پر یہ اتمام حجت ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنا فیصلہ سناتے ہیں۔ وقت کے رسول اور اس کے پیروکاروں کو ہجرت کا حکم ہو جاتا ہے اور پھر خدا کے عذاب کا کوڑا برس جاتا ہے۔

ایک رسول کے اتمام حجت کی یہی وہ اہمیت ہے جس کی بنا پر حضرت یونس کی قوم پر آیا ہوا عذاب ٹل گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سیدنا یونس نے اپنی قوم کے کفر کے بعد، رسولوں کی اس تاریخ کی بنا پر جس میں کفر کے بعد قوم کی تباہی یقینی ہوتی ہے، انھیں عذاب کی دھمکی دی اور اجتہادی فیصلہ کر کے ہجرت کر گئے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ابھی قوم کو چھوڑنے کا حکم نہیں آیا تھا۔ اس بات کا مطلب تھا کہ ابھی قوم پر اتمام حجت نہیں ہوا۔ بہر حال ان کی قوم پر جب عذاب کے آثار آئے تو پوری قوم نے اجتماعی طور پر توبہ کر لی۔ قرآن سورۂ یونس (۱۰) آیت ۹۸ اور سورۂ صافات (۳۷) آیات ۱۳۹ تا ۱۴۸ میں ان کا قصہ بیان کرتا ہے۔ نیز سورۂ انبیاء (۲۱) آیت ۸۷ تا ۸۸ اور سورۂ قلم (۶۸) آیات ۴۸ تا ۵۰ میں بھی ان کا تذکرہ ہے۔

قرآن میں مذکور رسولوں کی پوری تاریخ میں صرف سیدنا عیسیٰ کے مخاطب بنی اسرائیل ایک استثنا ہیں جن کی قوم کو کفر کے باوجود فنا نہیں کیا گیا۔ شاید اس کی وجہ توحید سے ان کی کسی نہ کسی درجہ میں وابستگی تھی۔ تاہم ان پر خدا کا عذاب آیا جس کی نوعیت کو سورۂ اعراف (۷) آیت ۱۶۷ اور سورۂ آل عمران (۳) آیات ۵۵ تا ۵۶ میں بیان کیا گیا ہے۔ جس کے مطابق قیامت تک ان پر عذاب کا سلسلہ جاری کیا گیا۔ نیز سورۂ بقرہ (۲) آیت ۶۱ اور سورۂ آل عمران (۳) آیت ۱۱۲ کے مطابق ذلت، مسکنت اور خدا کا غضب اب ان کا مقدر ہے۔ اس کے علاوہ نبوت کا سلسلہ ان سے ختم کر دیا، اقوام عالم پر فضیلت اور اپنی نمائندگی کا اعزاز ان سے چھین لیا۔ سب سے بڑھ کر قیامت کے دن کا عذاب اپنی جگہ ہے۔

رسولوں کے اتمامِ حجت کا یہی وہ قانون ہے جس کے مطابق محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطبین پر عذاب آیا۔ ہم نے پچھلی جن سورتوں کے حوالے دیے ہیں، ان میں ان اقوامِ سابقہ کا ذکر کفارِ قریش کو سمجھانے کے لیے ہی کیا گیا تھا کہ اگر تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کی تو تمھارا انجام بھی یہی ہو گا۔ چنانچہ یہی ہوا۔ البتہ ان پر عذاب حضور صلی اللہ علیہ

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

وسلم کے اصحاب کی تلواروں کے ذریعے سے آیا۔ قرآن کی سورۂ انفال (۸) اور سورۂ توبہ (۹) اسی عذاب الٰہی کی تفصیل کرتی ہیں۔ قریش کی پوری قیادت جس نے تیرہ سال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی تھی، جنگ بدر میں ہلاک ہوئی۔ حتیٰ کہ ابولہب جو اس جنگ میں شریک نہیں ہوا تھا، اس پر عدسہ (طاعون) کی بیماری کا عذاب مسلط کر کے اسی موقع پر اسے بھی ہلاک کر دیا گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری دور میں پورے عرب کو قبول اسلام کی دعوت دی گئی جس کی نافرمانی پر صحابہ کی تلواروں سے ان کو ہلاک کرنے کا حکم دیا گیا۔ ارشاد ہوا:

''تم ان سے لڑو! اللہ تمھارے ہاتھوں ان کو سزا دے گا، ان کو رسوا کرے گا، تم کو ان پر غلبہ دے گا، اہل ایمان کے ایک گروہ کے کلیجے ٹھنڈے کرے گا اور ان کے دلوں کا غم وغصہ دور فرمائے گا اور جن کو چاہے گا توبہ کی توفیق دے گا۔ اور اللہ علم وحکمت والا ہے۔'' (التوبہ ۹: ۱۴۔۱۵)

تاہم اس کی نوبت نہیں آئی اور پورا عرب حلقہ بگوش اسلام ہو گیا۔ اس کے بعد صحابہ کو جو عروج خلافت راشدہ میں ملا، اس کی مثال تاریخ انسانی میں نہیں ملتی۔ ان کو انعام کے طور پر دنیا کی بادشاہت دے دی گئی۔ جس کی خبر انھیں پہلے ہی اس طرح دے دی گئی تھی۔

''تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے عمل صالح کیے، ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ ملک میں ان کو اقتدار بخشے گا، جیسا کہ ان لوگوں کو اقتدار بخشا جو ان سے پہلے گزرے، اور ان کے لیے ان کے اس دین کو متمکن کرے گا جس کو ان کے لیے پسندیدہ ٹھیرایا، اور ان کی اس خوف کی حالت کے بعد اس کو امن سے بدل دے گا۔'' (النور ۲۴: ۵۵)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

بہر حال رسولوں کی قوموں کے بارے میں خدا کا قانون یہ ہے کہ ان کے عروج وزوال کا تمام تر انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ وہ اللہ کے رسول کی بات مانتے ہیں یا نہیں۔ وہ اگر ایمان لے آتے ہیں تو خدا ان کے دشمنوں کو ہلاک کر کے انھیں دنیا کا اقتدار سونپ دیتا ہے۔ صحابۂ کرام کے سلسلے میں یہی ہوا۔ اگر وہ تکذیب کرتے ہیں تو انھیں ان کی تمام تر طاقت اور اقتدار کے ساتھ ہلاک کر دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ دیگر تمام رسولوں کی اقوام کے ساتھ معاملہ ہوا۔ البتہ حضرت موسیٰ کی قوم کے سلسلے میں معاملہ بین بین رہا۔ بنی اسرائیل آپ پر ایمان لے آئے تو ان کے دشمن فرعون کو اس کے کفر کی پاداش میں ہلاک کر دیا گیا اور فرعون کی غلامی سے انھیں نجات دے دی گئی۔ تاہم جب انھوں حضرت موسیٰ کی نافرمانی کی تو انھیں عروج سے محروم کر کے ان پر خواری مسلط کر دی گئی۔ سورۂ مائدہ (۵) آیات ۲۱ تا ۲۶ میں اس کا تفصیلی واقعہ بیان ہوا ہے۔

اس قانون کے حوالے سے آخری اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہی اب یہ قانون قیامت تک کے لیے ختم ہو گیا۔ اب کسی رسول نے آنا ہے نہ کسی نبی نے۔ اس لیے دنیا میں کسی قوم کے عروج وزوال کے لیے اب اس قانون کے کسی پہلو کا کوئی اطلاق نہیں ہو سکتا۔

[باقی]

محمد بلال

ایک عراقی کا سوال

یہ مارچ ۲۰۰۳ کی ۲۸ تاریخ تھی۔اس کی رات میں بھی عراقیوں پر قیامت ٹوٹی تھی۔ بغداد کی شہری آبادی پر تعلیم اور تہذیب کے علم برداروں نے بدترین بم باری کی تھی۔لاشوں اور زخمیوں کے ڈھیر لگ گئے تھے۔ہسپتالوں کے کمرے اور برآمدے ناکافی ہو گئے تھے۔ٹی وی لاشوں کے دل ہلا دینے والے منظر دکھا رہا تھا۔ایک عراقی ایک لاش کے پاس کھڑا چلا رہا تھا:

''یہ ابھی ایک گھنٹا پہلے نماز پڑھ رہا تھا..... یہ اب بولتا کیوں نہیں؟''

میں نے یہ سوال سنا تو میری زبان سے تو کچھ نہ نکلا، مگر میرے دل نے بے اختیار کہا:

''میرے بھائی، یہ اس لیے خاموش ہے کہ یہ اس سوال کا جواب دینے کا ذمہ دار نہیں ہے۔اس زندہ کو مردہ بنانے والے، اس زندگی کو موت میں بدلنے والے، اس آواز کو سکوت میں ڈھالنے والے کچھ اور لوگ ہیں۔تمھارے سوال کا جواب دینے کے ذمہ دار کچھ اور لوگ ہیں۔اور وہ لوگ بھی درحقیقت لاشیں ہیں، مگر زندہ لاشیں۔ان کا صرف حیوانی وجود زندہ ہے۔ان کی صرف حرص و ہوس زندہ ہے۔ان کا صرف جوشِ جنوں زندہ ہے۔مگر ان کے دل کو کفنایا جا چکا ہے۔ان کے ضمیر کا جنازہ اٹھایا جا چکا ہے۔ان کے شعور کو دفنایا جا چکا ہے۔

تم یہ سوال ان زندہ لاشوں سے پوچھو، جن کی آنکھوں میں برتری کا خواب خون بن کر اتر آیا ہے۔ جو امکانی خطرے کو جنگ کا جواز بنا کر اتھاہ پستیوں میں گر چکے ہیں۔ جو اپنے مفادات کی خاطر دوسروں کو برباد کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ جو اپنی زندگی کی آسایشوں کی خاطر دوسروں کی زندگی چھیننے پر تیار ہو گئے ہیں۔ جو کائنات کو تسخیر کرتے کرتے پتھر کے زمانے میں جا پڑے ہیں۔

تم یہ سوال ان زندہ لاشوں سے پوچھو جنھوں نے ایران پر حملہ کیا تھا۔جنھوں نے کویت پر دھاوا بول دیا تھا۔جنھوں نے

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کویت پر قبضہ کرنے کے بعد اسے اپنا صوبہ قرار دے دیا تھا۔ جن کا کویت کے ذکر کرنے پر یہ کہنا تھا کہ اس کا ذکر نہ کریں، کویت اب ایک قصۂ ماضی ہے۔

تم یہ سوال ان زندہ لاشوں سے پوچھو جنھیں خدا نے سیال سونے کے سمندروں سے نوازا، مگر انھوں نے کتب خانے اور تجربہ گاہیں بنانے کے بجائے اپنے وسیع محلات تعمیر کیے اور رنگین عشرت کدے سجائے۔ جنھیں خدا نے اقتدار دیا، مگر انھوں نے اسے اپنا ذاتی خزانہ سمجھ لیا اور اس پر سانپ بن کر بیٹھ گئے۔ جو مسلمان ہونے اور اس دور میں پیدا ہونے کے باوجود بادشاہ سلامت بن گئے۔ جنھوں نے تمھارے ہاتھ میں بندوق پکڑا کر تمھیں ہزاروں ٹینکوں سے مقابلہ کرنے پر مجبور کر دیا۔ جنھوں نے بموں کی طوفانی بارش سے لڑنے کے لیے تمھیں نہتا کھلے میدان میں اتار دیا۔

مگر یہ زندہ لاشیں بھی نہیں بولیں گی۔ یہ تمھیں اس قابل ہی نہیں سمجھتیں کہ تمھارے سوال کا جواب دیں۔ ایسے میں مایوسی بھی تم پر حملہ کر دے گی۔ بے عملی بھی تمھیں مغلوب کرنے کوشش کرے گی، مگر تم کو مایوس نہیں ہونا۔ میدان عمل نہیں چھوڑنا۔ تاریکی سورج ڈوبنے سے نہیں، امید ٹوٹنے سے پھیلتی ہے۔ تم کو جلد از جلد امن خریدنا ہے۔ دنیا میں اپنا تاثر بدلنا ہے۔ پوری سرگرمی اور دل سوزی کے ساتھ ہر سطح پر اور ہر شکل میں تعلیم کا اہتمام کرنا ہے۔ ان زندہ لاشوں نے جو تاریکی پھیلا دی ہے، تم کو اس میں ہمت اور حکمت کے ساتھ یہ چراغ جلانا ہے۔ اور تیز ہواؤں کے باوجود اسے جلائے رکھنا ہے۔ زرد پتوں سے بھرے ہونے کے باوجود، اسی آنگن میں نیا پیڑ لگانا ہے۔ ہجوم میں گھرے ہونے کے باوجود، اسی ہجوم سے کارواں بنانا ہے۔ اور آبشاروں کی یہ صدا سنتے رہنا ہے کہ عزم سفر ہو تو چٹانیں بھی راستہ بن جایا کرتی ہیں۔ اسی راستے کے سرے پر وہ منزل ہے جو اگر تم نے پالی تو پھر تمھیں دوبارہ ایسا سوال کرنے کی کبھی ضرورت نہیں پڑے گی۔

اور یہ حقیقت بھی ہر وقت یاد رکھنی ہے کہ اس ورلڈ آرڈر نے ہمیشہ نہیں رہنا، بلکہ اس ورلڈ ہی نے ہمیشہ نہیں رہنا۔ ایک دن ایسا آنا ہے جب تاج اچھال دیے جانے ہیں۔ سرحدیں مٹا دی جانی ہیں۔ پہاڑ اڑا دیے جانے ہیں۔ سمندر سیلاب بنا دیے جانے ہیں۔ پھر رب کائنات کا عدل ظہور میں آئے گا۔ سپریم پاور کا تخت لگے گا۔ پھر وہ سب خوف سے کانپ رہے ہوں گے جو آج لاشوں پر لاشیں بچھا رہے ہیں اور ان پر قہقہے لگا رہے ہیں۔ تب ہر ظالم اور ہر قاتل؛ ہر مظلوم اور ہر مقتول کی مٹھی میں ہو گا۔ تب انھیں ایک ایک قتل کا حساب دینا ہوگا۔ ایک ایک قتل کے بدلے میں بار بار قتل ہونا ہوگا...... اور یہ جو ابھی ایک گھنٹا پہلے نماز پڑھ رہا تھا اور اب بول نہیں رہا، یہ اُس وقت بولے گا، ہاں اُس وقت بولے گا۔"

جاننے کی بات

اس دنیا میں اور بالخصوص اس مملکت خداداد میں جو بات آج ہر شخص جانتا ہے، وہ یہ ہے کہ اس کی زندگی خوشیوں سے محروم ہے، زندگی کے مسائل کا وہ کوہ گراں ہے کہ جس کے بوجھ تلے دب کر اس کا وجود پسا جا رہا ہے، وہ محرومی کی ایسی کہانی ہے جو صرف دکھوں سے عبارت ہے، وہ مایوسی کی شبِ تاریک ہے جس کے نصیب میں صبحِ امید کے سورج کا طلوع نہیں۔

لوگ روزگار کے لیے پریشان ہیں، مہنگائی کے عذاب میں مبتلا ہیں، طرح طرح کی بیماریوں کا شکار ہیں، اچھے رشتوں کے نہ ملنے سے نالاں ہیں، بدامنی و خوف سے لرزاں ہیں۔ غرض ایک ختم نہ ہونے والی پرابلم لسٹ ہے، جس نے داستانِ حیات کو داستانِ غم بنا دیا ہے۔

ایسے میں کچھ لوگ اس دعوے کے ساتھ اٹھتے ہیں کہ ان کے پاس وہ امرت دھارا ہے جو ہر درد کی دوا ہے۔ بس عوام اپنے کندھوں پر بٹھا کر انھیں اقتدار کی کرسی تک پہنچا دیں۔ ان میں سے ہر شخص کے پاس اپنی سچائی میں کہنے کو بہت کچھ ہے۔ بعض آسمانی صحائف کو اپنی صداقت کا گواہ ٹھیراتے ہیں اور بعض زمینی حقائق کو اپنے برسرِ حق ہونے کی دلیل گردانتے ہیں۔

آپ نے ان لوگوں کی باتیں سن ہی لی ہوں گی۔ ان کے دلائل جان ہی لیے ہوں گے۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ لمحہ بھر ٹھیر کر آپ ہماری بات بھی سن لیں۔

ہم یہ مانتے ہیں کہ مسائل کی کثرت اور خواہشات کی عدم تسکین نے دنیا کی زندگی کو مشکل بنا دیا ہے، مگر ذہن میں رہے، یہ ایک ادھوری بات ہے۔ اس ادھوری بات کی وجہ سے بہت سے لوگ اپنے خالق سے برگشتہ ہو گئے۔ اس کے منکر ہو گئے۔ اور یوں وہ الحادی تہذیب وجود میں آئی جو آج دھرتی کے خشک وتر پر حکمران ہے۔

پھر پوری بات کیا ہے؟ پوری بات یہ ہے کہ انسان ایک ابدی مخلوق ہے۔ اسے اپنی لامحدود زندگی کا بہت تھوڑا حصہ اس دنیا میں گزارنا ہے۔ اور پھر کبھی نہ ختم ہونے والی آخرت ہے جو خود اس دنیا کا جوڑا ہے۔ فرق یہ ہے کہ دنیا فانی ہے اور آخرت

لا فانی، دنیا کے غم عارضی ہیں اور آخرت کا عذاب ابدی، یہاں کی لذت ناقص ہے اور وہاں کی لذت کامل۔

اس دنیا میں خدا نے غم والم آپ کو دکھی کرنے کے لیے نہیں رکھے، بلکہ ان کا مقصد آپ کی آزمایش ہے کہ ان حالات میں آپ صبر کرتے ہیں یا نہیں۔ ایک اور پہلو سے دیکھیں تو ان کا مقصد یہ بھی ہے کہ آپ آخرت کے ناقابل برداشت عذاب کا اندازہ کریں اور اس سے بچنے کی سعی کریں اور اگر لذت کی عدمِ تسکین رکھی ہے تو محض اس لیے کہ آپ خدا کی جنت کو چھوڑ کر دنیا کی اس سرائے کو اپنا مستقل گھر نہ سمجھ بیٹھیں۔

جان لیجیے، اپنے بارے میں خدا کی اسکیم جان لیجیے۔ خدا یہ چاہتا ہے کہ دکھوں کی آگ آپ کے وجود کو جھلسائے تاکہ آپ پر بے حسی کی نیند طاری نہ ہو، آپ جہنم سے بھاگنے والے بنیں۔ آپ کو محرومی کے تجربے سے گزارا جائے تاکہ آپ جنت سے محرومی کی تکلیف کو یاد رکھیں۔

جان لیجیے، اس دنیا کے غم کبھی ختم نہیں ہوں گے۔ غموں سے خالی معاشرہ اس زمین پر کبھی قائم ہوا ہے اور نہ کبھی قائم ہوگا۔ یہ کام تو خدا کے پیغمبر بھی نہ کر سکے اور وہ یہ کام کرنے کے لیے آئے بھی نہیں تھے۔ اس لیے کہ پرابلم فری سوسائٹی خدا کے دنیا بنانے کے منصوبے کے خلاف ہے۔ وہ تو یہ بتانے آئے تھے کہ یہ دنیا، یہ عارضی دنیا، خدا کی بات ماننے کی جگہ ہے۔ اپنی بات منوانے کی جگہ تو آگے آرہی ہے۔ اس دنیا میں خدا آزمارہا ہے۔ اس کی مرضی چل رہی ہے۔ اُس دنیا میں تمھاری مرضی ہوگی، تم خدا کو آزمالینا، جو چاہو مانگ لینا، جو چاہو لے لینا۔

ـــــ ریحان احمد یوسفی

اپنے کل کو روشن کیجیے

اولاد انسان کا بہترین سرمایہ ہے۔ یہ اس کی ذات کا تسلسل ہی نہیں، اس کی امیدوں اور خواہشوں کا سب سے بڑا مرکز بھی ہے۔ ہم میں سے کون ہے جو اپنی اولاد کے برے مستقبل کا تصور بھی کر سکے۔ لیکن اولاد کا اچھا مستقبل صرف خواہشوں اور تمناؤں کے سہارے وجود پزیر نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے ایک واضح اور متعین لائحۂ عمل کی ضرورت ہے۔ ذیل میں ہم اختصار کے ساتھ وہ لائحۂ عمل بیان کر رہے ہیں جو دنیا اور آخرت دونوں میں آپ کی اولاد کو آپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک بنا دے گا۔

اچھے خیالات اچھی زندگی

عام طور پر والدین اولاد کا دامن خوشیوں سے بھر دینے کی فکر میں رہتے ہیں۔ خوشیوں سے ان کی مراد بالعموم مادی اشیا کی

بہتات ہوتی ہے۔تاہم خوشی صرف مادی اشیا سے نہیں ملتی۔خوشی زندگی کے بارے میں مثبت نقطۂ نظر اختیار کرنے سے ملتی ہے۔اس دنیا میں دکھوں، پریشانیوں اور ناپسندیدہ حالات سے مفر ممکن نہیں ہے۔آپ کچھ بھی کر لیں، برے حالات سے اپنی اولاد کو بچا نہیں سکتے۔

ہاں ایک طریقہ ایسا ہے جس سے آپ کی اولاد پر مصائب و آلام کی آگ ٹھنڈی ہو سکتی ہے۔ وہ یہ کہ آپ اپنی اولاد کو زندگی کے بارے میں مثبت نقطۂ نظر دیں۔ اسے بتائیں کہ دنیا میں سخت حالات ہی بہترین انسانوں کو جنم دیتے ہیں۔اس اعتبار سے یہ سختیاں خدا کی نعمت ہیں۔ یہ ایک طرف انسان کی صلاحیتوں کو بہترین طریقے سے پروان چڑھاتی ہیں اور دوسری طرف آخرت میں خدا کی رضا اور اس کی بہترین نعمتوں کے حصول کا ذریعہ بھی بنتی ہیں۔ چنانچہ بچوں کو یہ سبق دیں کہ وہ مشکلات کو چیلنج کے طور پر لیں۔اس کے بعد وہی دکھ جو دوسروں کو نڈھال کر دیتے ہیں انھیں سرشار کر دیں گے۔

سخت محنت کی عادت

اولاد کو دینے والی دوسری چیز سخت محنت کرنے کی عادت ہے۔والدین لاڈ پیار میں بچوں کی زندگی آسان بنانا چاہتے ہیں۔مگر بے جا لاڈ پیار مستقبل میں ان کی زندگی مشکل بنا دیتا ہے۔لاڈ پیار سے بچے اکثر نکمے ہو جاتے ہیں۔اس دنیا میں نکمے اور ناکارہ لوگوں کی کامیابی کا کوئی امکان نہیں ہے۔کامیابی صرف سخت محنت سے ملتی ہے۔حتیٰ کہ ذہانت بھی محنت کے کندھوں پر بیٹھ کر ہی خود کو نمایاں کر پاتی ہے۔انگریزی میں کہا جاتا ہے:

‘‘Genius is ninety percent perspiration and only ten percent inspiration.’’

یعنی ذہانت نوے فیصد محنت ہے اور صرف دس فیصد دماغی صلاحیت۔

بچپن ہی سے اولاد کو سخت ذہنی اور جسمانی محنت کا عادی بنائیں۔اس کام کے لیے بچوں کے بڑے ہونے کا انتظار نہ کریں۔ بڑے ہونے پر تو بچوں کی عادتیں پختہ ہو جاتی ہیں جن کا بدلنا آسان نہیں رہتا۔عادتیں تو بچپن ہی میں ڈلوائی جاتی ہیں۔

آپ کا بچہ آپ سے سیکھتا ہے

بچہ ایک مکمل نقال ہوتا ہے۔وہ سب کچھ آپ سے یا آپ کے فراہم کردہ ماحول سے سیکھتا ہے۔لہٰذا آپ بچوں کو جیسا بنانا چاہتے ہیں، ویسے ہی بن جائیں اور انھیں اسی طرح کا ماحول فراہم کریں جو بچہ ہر وقت گھر میں جھوٹ سنے گا، اس سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ کتاب میں جھوٹ کی برائی پڑھ کر وہ اس سے نفرت کرنے لگے۔یہ ناممکن ہے۔

اسی طرح گھر میں کیبل اور ڈش لگا کر اور بچوں کو اخلاق و کردار کی قاتل فلموں کے حوالے کر کے یہ توقع کرنا کہ آپ کی اولاد بہت باحیا اٹھے گی، ایک ایسا خواب ہے جس کی تعبیر کبھی نہیں نکل سکتی۔آپ کے بچے آپ کے فراہم کردہ ماحول کا عکس ہوتے ہیں۔اب یہ آپ کو فیصلہ کرنا ہے کہ آپ انھیں کیسا بنانا چاہتے ہیں۔

ذاتی توجہ اور براہِ راست مکالمہ

وہ دور گیا جب بچے خود سے پل جایا کرتے تھے۔اب ہر بچہ ذاتی توجہ چاہتا ہے۔آپ کی تمام تر احتیاط کے باوجود معاشرے میں موجود شر اور برائیوں کا آپ کے بچے تک پہنچنا لازمی ہے۔یہ بچے سے آپ کا ذاتی تعلق ہے جو اسے ان برائیوں کے اثرات سے بچالے گا۔بچوں سے آپ کا دوستانہ تعلق اور براہِ راست مکالمہ وہ ذریعہ ہے جس سے آپ ہر برائی کے بارے میں ان کے ساتھ کھل کر گفتگو کر سکیں گے اور انھیں یہ بتا سکیں گے کہ یہ چیزیں ہماری مذہبی اور تہذیبی اقدار کے خلاف ہیں۔اس کے بغیر آپ کے بچے اپنے تجسس کو دور کرنے کے لیے ناسمجھ دوستوں، بیہودہ کتابوں اور دیگر ایسے ذرائع سے رجوع کریں گے جو ان کی ذہنی اور عملی گمراہی کا سبب بنیں گے۔

بچوں کی ذہن سازی کیجیے

بحیثیت مسلمان یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ دین کے بنیادی تصورات اپنے بچوں کو منتقل کریں۔اس دنیا کا ایک بنانے والا ہے۔اس نے ہماری رہنمائی کے لیے اپنے رسولوں کو بھیجا ہے۔اس کی رہنمائی دین کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ ہمیں ایک روز اپنے رب کے حضور پیش ہو کر اپنے اعمال کا جواب دینا ہے۔اچھے اعمال والے جنت اور برے اعمال والے جہنم میں جائیں گے۔یہ وہ بنیادی تصورات ہیں جن کی اپنی اولاد تک منتقلی ہماری بنیادی ذمہ داری ہے۔

اچھے اخلاقی تصورات مثلاً شرم وحیا، امانت و دیانت، صدق و عدل اور اس جیسی دیگر صفات کو بچوں کی شخصیت کا حصہ بنانا بھی والدین ہی کی ذمہ داری ہے۔اسی طرح معاملات کو گفت وشنید سے حل کرنا اور سنی سنائی باتوں کے بجائے تحقیق کے ذریعے حقائق تک پہنچنا اعلیٰ انسانی خصلتیں ہیں۔

مندرجہ بالا امور اختیار کرنے کے بعد امید ہے کہ آپ کی اولاد آپ کے اور معاشرے کے لیے ایک بہترین اور قابل فخر اثاثہ ثابت ہوگی۔اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ سے اپنی اولاد کی اصلاح اور بہتری کے لیے دعا کرتے رہیں، کیونکہ دعا مومن کا اصل ہتھیار ہے۔

ـــــ ریحان احمد یوسفی

دل و نظر کا سفینہ سنبھال کر لے جا

عصر حاضر میں میڈیا کی ترقی نے زندگی کے افق پر علم و آگہی کے جو نئے دریچے وا کیے ہیں، ماضی میں ان کی مثال نہیں

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ملتی۔ میڈیا کے انقلاب کے نتیجے میں رونما ہونے والی عظیم تبدیلی نے انسانوں کے لیے ایسے امکانات کو پیدا کر دیا ہے جو اس سے قبل ناقابلِ تصور تھے۔ آج ہم ان راہوں کے مسافر ہیں جہاں اس سے قبل کسی کے قدم نہیں پہنچے۔ پرانے تہذیبی دائرے ختم ہو رہے ہیں اور ان کی جگہ ایک نئی بین الاقوامی تہذیب جنم لے رہی ہے۔

اس تبدیلی کو وقوع پزیر ہونے سے روکا جا سکتا ہے نہ ایسا کرنے کی کوئی ضرورت ہے۔ اس پورے عمل میں، تاہم جس چیز کی اشد ضرورت ہے، وہ یہ ہے کہ صفحۂ دل کو اس غلاظت سے محفوظ رکھنے کی سعی کی جائے جو نگاہوں کے رستے انسان کے اندرون تک رسائی پا لیتی ہے۔

کمپیوٹر اور ٹی وی کی اسکرین سے رنگ و آہنگ اور ساز و آواز کی جو یلغار دل و دماغ پر ہوتی ہے، وہ حیران کن حد تک موثر ہے۔ اس سے قبل کہ ایک فرد یہ جان سکے کہ اس کے ساتھ کیا معاملہ ہو رہا ہے، بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔ لطف و سرور کا متلاشی ٹی وی، ڈش اور کیبل کے چینل اور انٹرنیٹ کی وادیوں میں آوارہ پھرتے پھرتے اپنے باطن کی پاکیزگی کھو دیتا ہے۔ یہ جانے بغیر کہ کس متاع بے بہا سے وہ ہاتھ دھو بیٹھا ہے۔ انسان کے وجود میں نگاہ قلب کا دروازہ ہوتی ہے۔ ہر آنے والا اسی راستے سے نہاں خانۂ دل کا مہمان ہوتا ہے۔ یہ دروازہ اگر ہر کس و ناکس کے لیے کھلا چھوڑ دیا جائے تو گو آنکھ روشن رہے، مگر پاکیزگی قلب کی روشنی سے انسان محروم ہو جاتا ہے۔ دو ہزار سال قبل حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے نگاہ کی اس غیر معمولی اہمیت کے پیش نظر ارشاد فرمایا تھا:

> ''تم سن چکے ہو کہ کہا گیا تھا کہ زنا نہ کرنا۔ لیکن میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ جس کسی نے کسی بری خواہش سے کسی عورت پر نگاہ کی وہ اپنے دل میں اس کے ساتھ زنا کر چکا۔'' (متی ۵: ۲۷۔ ۲۸)

آج زمانے نے نگاہ کی آلودگی کے وہ اسباب مہیا کر دیے ہیں جس کے بعد دل و نظر کا سفینہ بچا لے جانا بہت مشکل ہو چکا ہے۔ پناہ صرف اس شخص کے لیے ہے جو نگاہ کے دروازے پر خدا خوفی کی تلوار لے کر بیٹھ جائے۔ جو ایسا نہ کرے گا، وہ اس دوشیزہ کی طرح پچھتائے گا جو زمانے کی ہوا سے بے پروا ہو کر شہر کی رونق دیکھنے نکلی، مگر رات گئے جب گھر لوٹی تو اپنے وجود کی سب سے قیمتی شے ـــــ اپنی عصمت ـــــ گنوا بیٹھی تھی۔

ـــــ شہزاد سلیم / ریحان احمد یوسفی

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

— جاوید

O

اٹھتا ہے یہ ہر لفظ سے جو دل کا دھواں ہے
پھر اس میں عجب کیا کہ غزل مرثیہ خواں ہے

سینے میں کوئی درد ہے، پنہاں کبھی پیدا
پہلو میں دھڑکتا تھا جو آنکھوں سے رواں ہے

وہ دن ہے کہ ویرانی دل کھانے کو آئے
وہ شب ہے کہ ہر سانس پہ اک بار گراں ہے

تہذیب نے کچھ اور بھی سفاک بنا کر
آدم کو بتایا ہے کہ یہ تیرا جہاں ہے

دنیا کی سیاست میں کوئی حق ہے نہ باطل
ہر چیز یہاں معرکۂ سود و زیاں ہے

اٹھتی ہے صدا کوئی تو اربابِ سیاست
اس کو یہ سمجھتے ہیں کہ غوغاے سگاں ہے

افسوس کہ پژمردہ ہے انصاف کا چہرہ
اور ظلم کو دیکھیں تو وہ پہلے سے جواں ہے

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

بغداد میں یہ آہن و آتش کا تماشا
روتی ہے زمیں اور فلک اشک فشاں ہے
خورشید جہاں تاب تو ہے اب بھی افق پر
اس شہر میں لیکن شب تیرہ کا سماں ہے
واللہ کہ تم در پے بربادی جاں ہو
یہ شہر مری عظمت رفتہ کا نشاں ہے
اڑتا ہوا خاشاک ، یہ بکھری ہوئی لاشیں
انساں ہیں ،مگر اُن پہ بھی سایوں کا گماں ہے
باردو کی بارش ہے شب و روز یہاں اب
بچوں کو اماں ہے ، نہ بزرگوں کو اماں ہے
یہ ماؤں کی آغوش میں آزردہ نگاہیں
سنتا ہو اگر کوئی تو ان کی بھی زباں ہے
میں عاجز و درماندہ اسے دیکھ رہا ہوں
دینے کو اگر ہے تو یہی سوزِ نہاں ہے
ابلیس کے ہاتھوں میں ہے دنیا کی حکومت
یہ تیرا جہاں ہے تو خدا یا، تو کہاں ہے

---

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org